نیاز فتحپوری کا ایک طویل اور مسلسل افسانہ

نغمۂ کارواں

آیندہ جنوری ۳۸ء سے شایع ہونا شروع ہوگا

اور

"تاریخ اسلامی ہند" اس کے علاوہ ہے۔

نگار

جلد ۳۲	فہرست مضامین نومبر ۱۹۳۷ء	شمارہ ۵

ملاحظات ---------- ۲

مذہب کا مستقبل ---------- ۹

مجنوں ---------- جلیل اعظمی ---------- ۲۵

مفکرین عظام ـ (سقراط) ---------- ۳۳

مالک کا بچہ ---------- یوسف حسین زیدی ---------- ۴۲

ہمارے بزرگانِ ملت ---------- عبدالمالک آروی ---------- ۴۹

انتقادیات ---------- ل۔ احمد اکبرآبادی ---------- ۵۳

مکتوبات نیاز ---------- ۵۷

باب الاستفسار ---------- ۶۱

مطبوعات موصولہ ---------- ۶۵

منظومات ---------- اثر، تمکین سرمست، مجاز، فطرت، الطاف، فراق، اختر ---------- ۷۳

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

معاون:- جلیل اعظمی

جلد ۳۲	نومبر ۳۷ء	شمار ۵

ملاحظات

مسلم لیگ کا غوغائے بے ہنگام

وسط اکتوبر کا وہ ہفتہ جو مسلم لیگ کے جلسوں کے لئے وقف تھا ختم ہو چکا ہے اور اس کی کارروائیاں ملک کے تمام اخبارات و جرائد میں شایع ہو کر اہل ملک کے علم میں آچکی ہیں اس لئے اب کہ یہ تمام ہنگامے ختم ہو چکے ہیں اور تقریروں اور تجویزوں کا تمام لٹریچر سامنے آچکا ہے، ضرورت ہے کہ سکون کے ساتھ ہر شخص اپنی اپنی جگہ غور کرے کہ "مسلم لیگ" نے اپنے اس یادگار ہفتہ میں کیا نئی چیز پیش کی، ہمارے لئے کونسی راہ اس نے متعین کی اور وہ کونسے غیر متوقع برکات ہیں جو صاحبدلانِ لیگ کے اس مقدس اجتماع کی وجہ سے مسلمانانِ ہند پر نازل ہونے والے ہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ لیگ کا یہ اجلاس کثرتِ شرکاء کے لحاظ سے غیر معمولی اجلاس تھا اور اگر محض سامعین کی کثرت کسی جلسہ کی کامیابی کی دلیل ہو سکتی ہے تو خداوندانِ لیگ اس کامیابی پر یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں، لیکن اگر کسی جلسہ کی کامیابی کے لئے اجتماعی روح اور مضبوط اصول کارفرما پایا جانا بھی ضروری ہے تو ہمیں افسوس ہے کہ

لیگ کے جلسے مطلق کامیاب نہیں ہوئے۔ کیونکہ لیگ کی کارروائیوں کا تجزیہ کرنے پر صرف دو چیزیں آپ کو نظر آئیں گی۔ "نوحہ و ماتم اور سب و شتم"۔ ماتم اپنی خستہ حالیوں پر، گالیاں مخالف جماعت پر۔ اور ظاہر ہے کہ جس جلسہ میں انجمن استقبالیہ کے صدر راجہ صاحب محمود آباد ایسے لوگ ہوں وہاں سوائے اس "ہائے ہائے۔ وائے وائے" کے اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ رہے مسٹر جینا سو ان کی اسلام دوستی تو اسی وقت ظاہر ہو گئی تھی جب تحریک خلافت کے سلسلہ میں وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر مسلمانوں سے علٰحدہ ہوئے اور کامل چار سال تک ایسا زبردست خوف ان پر طاری رہا کہ مسلم لیگ کا نام سنکر ان کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا

راجہ صاحب محمود آباد نے اپنے استقبالیہ خطبہ میں یونتو جو کچھ فرمایا ہے خوب ہے، لیکن دو تین باتیں اس قدر عجیب و غریب کہی ہیں کہ ان کو سنکر اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ان کے "دست و بازو" کو نظر نہ لگ جائے۔ فرماتے ہیں:۔

"ہم نے اپنے برادران وطن کو بار بار یقین دلایا ہے کہ جنگ آزادی میں ہم ان کے دوش بدوش کھڑے ہونے کے لئے طیار ہیں"

اگر اس ہم میں راجہ صاحب کی ذات بھی شامل ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ الفاظ ان کی زبان سے نکلے کیونکر۔ یہ راجہ صاحبان اور تعلقہ داران جو ایک ایک فرنگی کو اپنا "معبود" سمجھتے ہیں، جن کا سرمایہ دارانہ عیش و نشاط صرف برطانوی رحم و کرم پر منحصر ہے، اور جو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ملک کا آزاد ہونا ان کی ہلاکت کا مترادف ہے آزادی کا لفظ زبان سے نکالنے کا یقیناً کوئی حق نہیں رکھتے اور اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ دنیا کو دھوکا دینا چاہتے ہیں کیونکہ ان کا دل اُن کی زبان کا ہم آہنگ نہیں اور ان کا مقصود اس سے صرف یہ ہے کہ کانگریس کی راہ میں حایل ہو کر وہ برطانوی ملوکیت کو قوت پہونچائیں۔ اور ایسا ہونا چاہئے کیونکہ اگر سال بھر تک گورنر کے ساتھ متعدد ڈنر کھانے کے بعد اتنا بھی حق نمک انھوں نے ادا نہ کیا تو آیندہ خوان حکومت سے ریزہ چینی کی کیا امید ان کی وابستہ ہو سکتی ہے۔

راجہ صاحب بالقابہ اسی دعوائے آزادی کی تکرار دوسری جگہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"آج یہاں کوئی ایسا مسلمان موجود نہیں ہے جو خیال اور عمل کی آزادی کا خواہاں نہ ہو اور جو آزاد ملک میں رہنے کا خواہشمند نہ ہو۔ جو لوگ ہم کو رجعت پسند کہتے ہیں ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ وہ مسلمانوں سے خطاب کر رہے ہیں، جن کے مذہب نے انھیں آزادی کی تعلیم دی ہے اور جس کے بغیر وہ صحیح معنے میں زندہ نہیں رہ سکتے۔

جس جلسہ میں مسلمانوں کی موجودگی کا ذکر راجہ صاحب نے کیا ہے اس میں سب سے بڑی ہستیاں راجہ صاحب محمود آباد اور مسٹر جینا کی تھیں اور اس لئے اصولاً انھیں کو سب سے بڑا مسلمان کہنا چاہئے، سو اس باب میں ہمیں اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر اسلام محدود ہے بریرنہ پا تعزیوں کے ساتھ صرف کربلا تک جانے کی حد تک یا

سال بھر میں صرف تین بار مسجد میں جاکر شرکتِ نماز کی حد تک، تو ان دونوں کے بڑے مسلمان ہونے میں شک کرنا یقیناً کفر کے مترادف ہے، ورنہ یوں کس کو نہیں معلوم کہ زنجبار اور شریعت بل کے مسایل میں جینا نے کیا کیا اور اتحاد ملت کے لئے راجہ صاحب محمود آباد کیا کر رہے ہیں۔

راجہ صاحب نے نہایت پرزور الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ "اسلام نے انھیں آزادی کی تعلیم دی ہے اور اسکے بغیر وہ صحیح معنے میں زندہ نہیں رہ سکتے"۔ لیکن آزادی کا کوئی مفہوم انھوں نے متعین نہیں کیا۔ تاہم قیاس یہی ہے کہ اس میں وہ جبیں سائیاں ضرور شامل ہوں گی جو آستانۂ برطانیہ کے حضور میں پیش کی جاتی ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کیوں کہتے۔

راجہ صاحب اپنے خطبۂ صدارت میں ایک جگہ اور عجیب و غریب انکشاف سے کام لیتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:-

> "مسلمانوں کی شرکت کے بغیر کوئی سیاسی جد و جہد مناسب اور کافی طور پر عمل میں نہیں آسکی، جب ہم قومی جنگ میں کود پڑے تبھی ہندوستان کے لئے حکومتِ خود اختیاری عملی سیاسیات کی حدود میں آسکی"۔

بجا ارشاد ہوا۔ سیاسیات ہند تو خیر بڑی چیز ہے، مسلمان رہنماؤں نے سیاسیات قومی میں بھی جس جد و جہد سے کام لیا ہے وہ یا تو حماقت پر مبنی رہی ہے یا خود غرضی پر۔ اس "فرقۂ زہاد" سے الا ماشاء اللہ کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں اُٹھا جس نے صحیح معنے میں ایثار و خلوص سے کام لیا ہو اور اگر کوئی شخص ایسا نکلا بھی تو انجام کار وہ اپنا عقلی توازن ہاتھ سے کھو بیٹھا۔

راجہ صاحب فرماتے ہیں کہ جب "مسلمان قومی جنگ میں کود پڑے تبھی ہندوستان کے لئے حکومتِ خود اختیاری عملی سیاسیات کی حدود میں آسکی"۔ "عملی سیاسیات" سے مراد اُن کی غالباً جدید کانسٹی ٹیوشن ہے، اور اس میں شک نہیں کہ جدید کانسٹی ٹیوشن جس پر ہندوستان کی کوئی جماعت مطمئن نہیں مسلمانوں ہی کی احمقانہ و بزدلانہ شرکت کا نتیجہ ہے اور اگر راجہ صاحب کو مسلمانوں کی یہی حرکت زیادہ محبوب نظر آتی ہے تو سوائے اسکے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

خجلت نگر کہ در حسنا تم نیاختند
جز روزۂ درست ز صہبا کشودۂ

اس میں شک نہیں کہ مسلم لیگ کے اس اجلاس کی کامیابی جس حد تک روپیہ صرف کرنے کا تعلق ہے، سراسر راجہ صاحب کی ممنونِ احسان ہے اور جس حد تک اجتماع کا تعلق ہے، سرمایہ داروں، زمینداروں اور خان بہادروں کی مرہونِ منت ہے۔ لیکن اگر راجہ صاحب نے غریب کاشتکاروں سے حاصل کیا ہوا روپیہ ان امرا برساکین پر

اس لئے صرف کیا ہے کہ وہ مسلمانوں میں کوئی قایدانہ حیثیت حاصل کرلیں تو ہمیں افسوس ہے کہ یہ سودا ناکام رہا کیونکہ اُن کے والد مرحوم کا زمانہ اب باقی نہیں رہا جب جسم میں صرف سوئی چبھو کر انسان مجاہد اعظم کا لقب حاصل کرسکتا تھا۔ اسوقت ضرورت سرفروشی کی ہے، اور یہ ہم جانتے ہیں کہ ان کا "سرِ عزیز" اس سے بہت زیادہ قیمتی ہے کہ سیاسیات ایسے معمولی کھیل میں اس کی بازی لگائی جائے۔

استقبالیہ کمیٹی کے خطبۂ صدارت کے بعد دوسرا اہم لٹریچر جو مسلم لیگ نے پیش کیا اور جس کی طرف تمام اسلامی ہند کے کان لگے ہوئے تھے وہ مسٹر جینا کا خطبہ تھا۔ لیکن آپ مجھ سے نہ پوچھئے خود پڑھئے اور فیصلہ کیجئے کہ مسلمانوں کے اس قایدِ اعظم نے کونسا معجزۂ عمل ایسا پیش کیا ہے جو ہماری تجدیدِ حیات کا ضامن ہو۔ اور سوائے کانگریس کو گالیاں دینے کے "لب لعلِ شکر خا" سے اور کیا فرمایا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسٹر جینا کا یہ خطبہ تعلیماتِ اسلامی کی صحیح تفسیر ہے۔ بیشک تفسیر ہے مگر صرف "تبت یدا" کی "لاتفسدو فی الارض" سے اس میں کوئی بحث نہیں کیگئی۔

خیال کیا، یقین تھا کہ مسٹر جینا کا یہ خطبہ ہماری قومی زندگی کو سنوارنے کے لئے کوئی خاص لائحۂ عمل پیش کریگا، ہماری اقتصادی دشواریوں کا کوئی حل بتائے گا، ہمارے افتراق کو دور کرکے کسی خاص مرکزِ عمل کی طرف رہنمائی کریگا اگر کانگریس واقعی مردود و مبغوض چیز ہے تو اس سے بلند تر کوئی اور نصب العین ہمارے لئے متعین کرے گا لیکن کسقدر حیرتناک امر ہے کہ پورے خطبۂ صدارت میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نظر نہیں آیا جو کانوں سے گزر کر دل تک پہونچتا۔ وہی معمولی آدمیوں کی سی معمولی باتیں، وہی بہت کچھ کہکر کچھ نہ کرنے والوں کی سی لفاظیاں، وہی وقتی جوش سے فایدہ اُٹھاکر عارضی ہنگامہ پیدا کرنے والی ترکیبیں اور وہی سب کچھ جو خلوص و صداقت سے معرّا باتوں میں ہوتا ہے مسٹر جینا کے خطبۂ صدارت میں بھی تھا۔

ایک طرف "توحید کی امانت" کا بھی ذکر تھا، تیغوں کے سایہ میں پلکر جوان ہونے کا بھی دعویٰ تھا، اور دوسری طرف "مجاہدین بدر و اُحد" کی اس دلیرنسل کی زبان پر یہ بھی تھا کہ "کانگرس ہندوؤں کی جماعت ہے اور ہندو ہم کو تباہ کردیں گے"۔

ہم مانتے ہیں کہ کانگرس میں ہندوؤں کی اکثریت ہے، اس کی تنظیم یکسر ہندو ذہنیت پر مبنی ہے اور تھوڑی دیر کے لئے ہم یہ بھی فرض کئے لیتے ہیں کہ ہندو جماعت مسلمانوں کو مٹا دینا چاہتی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا فاتحین مصر و ایران اور فرمانروایان ہند و افغانستان کی اولاد اب ایسی بزدل ہوگئی ہے کہ جس جماعت کو وہ اپنا دشمن جانتی ہے سی کو وہ آزاد چھوڑ دینے پر مجبور ہے۔ کیا مسٹر جینا اور ان کے رفقاءِ کار اتنی عقل بھی نہیں رکھتے کہ اگر کانگرس کو مطلق العنان چھوڑ دیا گیا اور اس کی کانسٹی ٹیوشن کو برابر ہندو ذہنیت کے ساتھ بدلتے رہنے دیا گیا تو اسکا نتیجہ یقیناً وہی ہوگا جس کا اندیشہ ہے ــــ مسلمانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ انھوں نے دشمن کے مقابلہ میں صرف

دفاعی پہلو کو کبھی ترقی کا ذریعہ قرار نہیں دیا، ان کا قدم جب اُٹھا آگے ہی بڑھا اور ان کی پالیسی ہمیشہ یہی رہی کہ مخالف عنصر کو مغلوب کرکے اس کی قوت کو توڑ دیا جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ اب مسلمانوں کو کانگرس کی ہندو ذہنیت مغلوب کرنے کا صحیح طریقہ یہی ایک نظر آتا ہے کہ اس سے علٰحدہ رہکر اس کے نشو و نما کو اور زیادہ ترقی کا موقعہ دیا جائے۔

کانگرس خالص سیاسی جماعت ہے جو بالکل اقتصادی اُصول پر کام کرنا چاہتی ہے اور اس میں اختلاف مسلک و مذہب کو مطلق کوئی دخل نہیں، اس لئے اگر مسلمان کانگرس کے مقاصد میں تبدیلی پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اسکی ہندو ذہنیت کو مٹانا ضروری سمجھتے ہیں تو اس کا طریقہ صرف یہی ہے کہ اس پر جاکر چھا جائیں نہ یہ کہ اس کو اپنے اوپر چھا جانے دیں۔

میں نے بعض لوگوں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت کبھی کانگرس میں نہیں ہو سکتی کیونکہ ۲۴ کروڑ کی تعداد بہرحال ۸ کروڑ سے زاید ہوتی ہے، اور یہ سنکر ہمیشہ مجھے تکلیف پہونچی ہے کیونکہ اس اندیشہ میں جو ذہنیت کام کر رہی ہے وہ ۲۴ کروڑ کو دیکھتی ہے اور ۸ کروڑ کو بجائے خود جو اہمیت حاصل ہے اس کو نظر انداز کر دیتی ہے اتنی بڑی جماعت کی یہ بزدلانہ رفتارِ خیال ارتقائی نقطۂ نظر سے اتنی گری ہوئی چیز ہے کہ دنیا کی کسی قوم نے اپنی انتہائی پستی کی حالت میں بھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ علاوہ اس کے یہ اندیشہ کرنے والوں کو سمجھنا چاہیئے کہ ہر چند ۲۴ کروڑ اور ۸ کروڑ میں بہت فرق ہے لیکن ہندوؤں کی اتنی بڑی آبادی میں نصف سے زیادہ وہ ہے جو قطعاً غیر ہندو ہے اور اسی بنا پر گاندھی جی نے ہریجن تحریک قایم کی تھی تاکہ ہندوؤں کی اکثریت واقعی اکثریت کی شکل پیدا کرلے۔ برخلاف اس کے مسلمانوں کی آبادی کا بڑا حصہ "منتخب حصہ" ہے اور اس لئے اگر آج صرف وہی حصہ کانگرس میں شرکت کا عزم کرلے تو کبھی ہندوؤں کی اکثریت کانگرس میں نہیں ہو سکتی۔

مسلم لیگ کے اس یادگار جلسہ میں سب سے زیادہ عجیب و غریب چیز وہ تھی جو بنگال سے آئی تھی۔ اس چیز کا نام مسٹر فضل حق تھا۔ یہ چیز چلتی پھرتی تھی، کھاتی پیتی تھی، لیکن کہا جاتا ہے کہ بولتی خوب تھی اور "دریں آئینہ" گالیوں کی اتنی اچھی مشق اسے کرائی گئی تھی کہ عجب نہیں بنگال میں ہمیشہ کے لئے یہ رولنگ ہو جائے کہ جب تک کوئی اتنی زہر افشاں نغمہ سنجی نہ کر سکے گا، کم از کم پریمیر کی جگہ کے لئے اس کا انتخاب عمل میں نہ آئے گا۔

مسٹر فضل حق نے دورانِ تقریر میں خود ہی اپنی گزشتہ سیرت پر تبصرہ بھی فرمایا ہے اور ہمیں حیرت ہے کہ اس تبصرہ کے پڑھنے کے بعد بھی مسلمان یہ یقین کرنے پر آمادہ نہیں کہ لیگ کے ساتھ ان کی ہمدردی حبِ علی کی وجہ سے نہیں بلکہ "بغضِ معاویہ" کی بنا پر ہے اور اگر آج انھیں معلوم ہو جائے کہ وزارت کی ضروری شرط کبھی "ترکِ اسلام" بھی ہو سکتی ہے تو ہمیں توقع رکھنا چاہیئے کہ سب سے پہلے انھیں کی پیشانی پر قشقہ نظر آئے گا۔

مسٹر فضل حق کا انتہائی جوش کی حالت میں یہ فرمانا کہ اگر ہندوؤں نے کسی صوبہ میں اپنی اکثریت سے فایدہ

اُٹھا کر مسلمانوں کو پریشان کیا تو وہ اس کا انتقام بنگال میں لیں گے، نہ صرف عالم سیاسیات بلکہ دنیائے تہذیب و شائستگی میں بھی ایک زبردست شاہکار ہے کہ اس خاکدانِ جہل و تاریکی میں تو اس کی مثال مل نہیں سکتی، ممکن ہے ملاءِ اعلیٰ کی مخلوق کوئی اس کی نظیر پیش کر سکے ۔ غضب خدا کا، صوبۂ بنگال ایسا اہم صوبہ اور اس کے وزیر اعظم کی یہ ذہنیت! جماعتِ اسلامی کا ایسا ذمہ دار فرد اور یہ سخافتِ خیال!

آسماں راحق بود گر خوں بگرید بر زمیں

اگر ذہن کی متانت و سنجیدگی اور خیال کی پاکیزگی و شرافت سے قطع نظر کر کے مسٹر فضل حق کی اس تدبیر کو واقعی کسی جنگ جویانہ تدبیر سے تعبیر کیا جائے تو بھی ہمیں افسوس ہے کہ اس سے زیادہ سفیہانہ و احمقانہ تدبیر کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ فرض کر لیجئے اگر ہندو مسلمانوں میں آج یہی مفاہمت ہو جائے کہ اکثریت کے لحاظ سے ہر صوبہ اپنے یہاں کی اقلیت کو پامال و تباہ کر سکتا ہے تو سوال یہ ہے کہ بہ حیثیت مجموعی نقصان کس جماعت کو پہونچے گا حیرت ہے کہ کانگرس میں شرکت کے وقت تو ۲ اور ۸ کی نسبت سامنے آجاتی ہے لیکن اس صورت میں اُسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

مسلم لیگ کے اجلاسِ سہ روزہ میں جتنی تقریریں ہوئی ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہے جس سے غور و فکر، یا تفکر و تدبر ظاہر ہوتا ہو۔ وہی غیر ذمہ دارانہ زبان میں غیر ذمہ دارانہ باتیں، وہی کانگرس کا رونا، وہی مذہب و سیاسیات کے تصادم کا اندیشہ اور ان سب باتوں کی تہ میں وہی خود غرضی، و نفس پرستی جو ایک پست قوم کے رہنماؤں کی خصوصیت خاصہ ہوا کرتی ہے۔

مسلم لیگ میں جتنی تجاویز پیش ہوئی ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہے جس میں مسلمانوں کے لئے کوئی تعمیری پروگرام سوچا گیا ہو یا اُن کی اقتصادی و تعلیمی پستی کی طرف توجہ کی گئی ہو۔ رہا یہ دعویٰ کہ مسلم لیگ نے کانگرس کے برخلاف اپنا نصب العین صحیح معنے میں مکمل آزادی قرار دیا ہے، سو اس کی حقیقت تجاویز کے ان کمزور الفاظ اور گدایانہ لب و لہجہ سے ظاہر ہے جس سے خان بہادرانہ التجا اور تعلقہ دارانہ فدویت تو ضرور ظاہر ہوتی ہے لیکن مردانہ عزم و مطالبہ کا اس میں کوسوں پتہ نہیں ۔ مسلم لیگ والوں کا کانگرس پر یہ اعتراض ہے کہ اس نے وزارت قبول کر کے حکومت کے طیار کئے ہوئے اُس کانسٹی ٹیوشن کو منظور کر لیا جو کسی طرح قابل قبول نہ تھا اور اس طرح اپنا نقطۂ نظر محدود کر کے صحیح آزادی کے مطالبہ کو ضعیف کر دیا۔ مانا کہ کانگرس کا وزارت قبول کر کے اس ناقابل قبول کانسٹی ٹیوشن کو چلانا آزادی کے منافی تھا، لیکن لیگ کی طرف سے مسلم پارلیمنٹری بورڈ کا قیام الکشن کے لئے جد و جہد اور وزارت میں شامل ہونے کے لئے بیتابی کیا معنی رکھتی تھی۔ اگر تشکیل وزارت سے انکار کر دینا ہی صحیح راستہ تھا اور آئین جدید کے خلاف احتجاج کی یہی بہتر صورت تھی جس کو کانگرس نے نظر انداز

کر دیا، تو مسلم لیگ کو کس نے مجبور کیا تھا کہ وہ اس صراطِ مستقیم سے ہٹ جائے اور کانسٹی ٹیوشن چلانے کے جرم میں کانگرس کی مدد کرے۔ بالکل درست فرمایا کہ اسوقت ملک میں جو بیداری پائی جا رہی ہے وہ سب مسلم لیگ ہی کی پیدا کی ہوئی ہے اور اگر اس کمبخت کانگرس کا قدم درمیان نہ ہوتا تو شاید مقصود کب کا حاصل ہو چکا ہوتا۔ سچ ہے

کارِ زلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہو چیں بستہ اند

حقیقت یہ ہے کہ برطانوی حکومت بڑی خوش اقبال حکومت ہے کہ ٹھیک اسی وقت جبکہ اس کی تعمیر متزلزل ہونے لگتی ہے کوئی نہ کوئی "مردِ غیب" ظاہر ہو کر "پشتی بان" بن جاتا ہے۔ اس مرتبہ جبکہ تعمیرِ حکومت بہت زیادہ خطرہ میں ہے "جینا و شرکاؤہ" نے سب سے زیادہ قوی "پشت پناہ" بننے کا فخر حاصل کیا۔ اور یہ وہ عزت ہے جو سوائے "خاصانِ خدا" کے مشکل سے کسی اور کو حاصل ہو سکتی ہے۔

پہلے ہندوستان دو ٹکڑوں میں منقسم تھا:۔ برطانوی ہند اور کانگرسی ہند۔ لیکن اب ایک اور نیا ٹکڑا "لیگی ہند" کا بھی پیدا ہو گیا ہے اور اس "ایجاد و اختراع" کا امتیاز قدرت نے صرف مسٹر جینا ہی کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ اور خدا کی اس عنایت پر "رشک و غبطہ" فضول ہے

اگر آئندہ جنوری ۳۸ء کا "نگار" آپ نے نہ دیکھا
تو
نیاز فتحپوری کی دو بہترین کتابوں سے آپ محروم رہیں گے

ایک ــــ تاریخ اسلامی ہند جو بالکل جدید اُصول پر انتہائی تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے،

دوسری ــــ "نغمۂ کارواں" ایک مسلسل افسانہ جو بالکل نئی تخیل کے ساتھ

جنوری ۳۸ء سے شایع ہونا شروع ہوگا اور دسمبر ۳۸ء تک جاری رہیگا

اس کی اطلاع اپنے احباب کو بھی کر دیجئے!

جنوری ۳۸ء کا نگار حسب معمول دو چند ضخامت کا ہوگا اور غیر خریداران نگار سے فی کاپی ۴ علاوہ محصول اس کی قیمت لیجائے گی

منیجر نگار

مذہب کا مستقبل

اس وقت دنیا مذہب کی طرف سے کافی بدگمان ہو چکی ہے اور اس کا مستقبل بہت تاریک نظر آتا ہے لیکن یہ خیال کرنا کہ یہ مغرب کے اسی عہد کی برکت ہے درست نہیں۔ مذہب کی طرف سے انحراف کب اور کیونکر شروع ہوا، اس کا سراغ لگانے کے لئے ہم کو یورپ کی ذہنی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

اُس دور میں جس کو ہم دورِ "نشاۃ ثانیہ" (Renaissance) یا "یورپ میں تہذیب و تمدن کی دوبارہ پیدائش" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ زندگی کے مختلف مسایل پر بحث کرنا ایک عام تفریح ہو گئی تھی، اُس زمانہ میں علمی حرارت اور تحقیق و تجسس کا ایسا جوش و ولولہ پایا جاتا تھا جو یورپ میں روم کی قیصریت کے فنا ہونے کے بعد پھر کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ لوگوں کو اُسوقت یہ پتہ چلا کہ دنیا میں ایسے بھی مسایل پائے جاتے ہیں جن کا انجیل میں تذکرہ ہے اور نہ جن کے متعلق پادریوں کی زبانیں کھلتی ہیں۔ چنانچہ ایسے ہی مسایل زندگی پر لوگ اکثر آپس میں بحث کیا کرتے تھے۔ اس چیز کی ابتدا سب سے پہلے اٹلی میں ہوئی اور پھر یہ مباحث انگلستان اور فرانس تک پھیل گئے۔

اٹلی کا ایک مشہور عالم اور "سابق پادری" گیارڈینو برونو (Giordano Bruno) جب تک وہ قتل ہونے سے محفوظ رہا) برابر پادریوں اور ان کی مہمل تعلیمات پر اعتراض کرتا رہا اور پھر اُس نے لندن کو اپنا مستقل قیام گاہ بنالیا۔ یہاں اُس نے اور سر فلپ سڈنی نے (جسے انگلستان میں ایک "بے داغ ہستی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) مفکرین کا ایک ایسا حلقہ بنالیا جو انسان اور دنیا پر بحث کیا کرتا تھا۔

چونکہ اس دور کے اکثر افراد ملحدانہ خیالات کے بھی حامل تھے اس لئے وہ مذہب کے مستقبل پر بھی بحث کیا کرتے تھے۔ ان میں سے مشہور ڈرامہ نویس کرسٹوفر مارلو اور ملکۂ الزبتھ کا مشہور درباری سر والٹر ریلے ایک قسم کا کلب بنائے ہوئے تھے جہاں مذہب کے مستقبل پر انتقاد و تبصرہ ہوا کرتا تھا۔ ان میں سے اکثر لوگوں کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ مذہب عیسوی باطل ہے کیونکہ علمی و تاریخی تحقیقات عیسویت کے افسانوں کو جھٹلا رہی تھیں۔ جہاز ران ایسے ممالک دریافت کر رہے تھے جو کبھی عیسیٰ کے خواب میں بھی نہ آئے تھے، منجم کائنات کے بارہ میں ایسے انکشافات کر رہے تھے جو عقل انسانی کی محدود چہار دیواری کی بنیادوں کو متزلزل کئے دے رہے تھے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ تحقیق و جستجو صرف ان لوگوں تک محدود تھی جن کے پاس فرصت تھی دولت تھی اور جو تمام دنیاوی علائق سے بے نیاز ہو کر اپنا سارا وقت اسی قسم کی تحقیق و تجسس میں صرف کرتے، ورنہ قوم کے زیادہ افراد جاہل تھے۔ وہ مطلق نہیں جانتے تھے کہ تحقیق جدید کیا ہے اور جب کسی بے دین یا ملحد، کو زندہ جلائے جاتے ہوئے دیکھتے تھے تو خوش ہوتے تھے۔ الغرض تعلیم یافتہ لوگ تو مذہب کو ناپسند کرتے تھے اور اس کے اصول سے انھیں اختلاف تھا لیکن قومی مصالح کی خاطر انھیں اپنے مذہب پر قایم رہنا پڑتا تھا۔

مگر ان تمام مباحث کے دوران میں ایک چیز کا فقدان تھا اور وہ "ارتقا کا خیال؟" تھا کسی کو یہ تصور بھی نہیں تھا کہ نظام معاشرت کسی وقت بالکل بدل جائے گا حتیٰ کہ جب سر ٹامس مور نے اپنی مشہور کتاب اٹوپیا (Utopia) لکھی تو بھی اُسے "باغی" نہیں سمجھا گیا کیونکہ اُس کتاب کے تجویز کردہ نظام معاشرت کے قوانین بالکل بعید از قیاس سمجھے گئے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نے انگریزی میں وہی چیز لکھی تھی جو اٹھارہ صدی قبل یونانی زبان میں افلاطون لکھ گیا تھا۔ تہذیب جدید کے نئے قوانین لوح آسماں پر لکھے جا چکے تھے مگر انسان کی آنکھیں اتنی ضعیف تھیں کہ وہ انھیں نہیں دیکھ پاتی تھیں اور اوہام پرستی کی پٹیاں ان پر بندھی ہوئی تھیں۔

لیکن اب ہماری نگاہوں میں زیادہ بصیرت پیدا ہو گئی ہے اور ہم ان مسائل کو ایسی صداقت کے معیار پر پرکھتے ہیں جس سے پہلے ہم لاعلم تھے۔ اب "قانون وقت" یا "امر حقیقت" لفظ "ترقی" (Progress) میں مضمر ہے۔

اگر واقعی نظام اشیاء کا کوئی قانون ابدی ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ ایک نظام کو دوسرے نظام میں تبدیل ہونا پڑیگا جیسے رات دن میں تبدیل ہوتی ہے۔ بہار، خزاں سے بدلتی ہے اور بچپن، جوانی سے بدلجاتا ہے۔ ابھی تک ہم اپنے "بزرگوں کی عقل" کی مثالیں پیش کیا کرتے تھے مگر موجودہ زمانہ میں اس فقرہ کو جو استعمال کرے اُسے بالکل احمق سمجھنا چاہئے ہمارے آباواجداد نہ یہ ہوائی جہاز بنا سکتے تھے، نہ ریل چلا سکتے اور نہ موٹر تو پھر ہم انھیں اپنے سے زیادہ عقلمند کیوں تسلیم کریں۔

بہرحال مذہب کو بھی بدلنا ہے اور نصف سے زیادہ دنیا اس کو تسلیم کر چکی ہے۔ وہ لوگ جن میں غور کرنے کی استعداد و صلاحیت موجود ہے اور ہمارے زمانہ کے وہ تعلیم یافتہ مرد و خواتین جن کو پڑھنے اور تصریر کے دونوں رُخ دیکھنے کا موقع ملتا ہے، ان میں سے اکثریت کو اس امر کا یقین ہو چکا ہے کہ مذہب مٹ جائے گا۔ اختلاف صرف اس بات پر ہے کہ انسانی آراء کی دوسری منزل کیا ہوگی۔

وہ پیشینگوئیاں جو ادبیات کی کتابوں میں بھری پڑی ہیں قابل تسلیم نہیں۔ اوایل اٹھارویں صدی میں بالمیز (Balmez) نے کہا تھا کہ پروٹسٹنٹ تہذیب (جرمنی ہالینڈ وغیرہ کی) ختم ہو رہی ہے، دنیا کے لئے پروٹسٹنٹ مصلحین کا پیغام بے اثر ثابت ہوا ہے اور کیتھولک سلطنتیں مثلاً فرانس، اسپین، پرتگال، آسٹریا وغیرہ دراصل دنیا

کی حکمران بن رہی ہیں۔ مگر اس پیشینگوئی کے نصف صدی بعد یہ دیکھا گیا کہ کیتھولک ممالک تنزل پذیر ہیں یا یہ کہ وہ اپنے سابقہ مذہب کو ترک کر چکے ہیں۔ عوام نے یہاں تک کہنا شروع کر دیا کہ پیس ثانی (Pius II) آخری پاپائے روما ہے۔ اس کے نصف صدی بعد لارڈ میکالے نے لکھا کہ پاپائے روم کا جھنڈا اڑتا ہی رہیگا۔ آج سے ۲۰ برس قبل ایک پیشین گوئی یہ کی گئی کہ کیتھولک مذہب سب سے پہلے نیست و نابود ہوگا۔ اسکے بعد اچ۔ جی۔ ولس نے یہ کہا کہ آج سے ایک ہزار برس کے بعد کے جدید شہروں میں بھی پیادہ پا راہب چلتے ہوئے دکھائی پڑیں گے۔

لہٰذا اس قسم کی پیشین گوئیوں کو سچا تسلیم نہیں کیا جا سکتا، گزشتہ عہد کی پیشین گوئیاں سیاسی یا فوجی نقل و حرکت اور تحریکات کی وجہ سے غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اب جو پیشین گوئی کی جائے وہ بھی غلط نہ ثابت ہو، مذہب کے بارہ میں آج یہی نظریہ ٹوکیو میں بھی پایا جاتا ہے، اور پکنگ میں بھی، بمبئی میں بھی اور قاہرہ میں بھی، قسطنطنیہ میں بھی اور ماسکو میں بھی!

غرضکہ مقامی حالات کچھ ہوں، اقوام عالم اپنے مسایل پر اس وقت تک رائے زنی کرتی رہیں گی جب تک ان کا منطقی حل نہ معلوم ہو جائے۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اس منطقی حل معلوم کرنے کے شرایط ہر دس برس کے بعد بدلجاتے ہیں اور ان میں سب سے بڑی شرط "علم" ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر عہد میں ایک الحاد پسند قلیل اقلیت یونان، روم، قرطبہ، فلورنس اور تقریباً ہر مقام پر پائی گئی ہے اور آخر میں اس اقلیت کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن یہ نتیجہ تھا اس امر کا کہ "کلچر" صرف اعلیٰ طبقوں تک محدود تھا! اور اب یہ "کلچر" "جمہوری" ہے۔ آج ۵۰ کروڑ انسان پڑھ سکتے ہیں اور ۵۰ برس کے بعد ان کی تعداد دوچند ہو جائے گی۔

اب سوال یہ ہو سکتا ہے کہ مانا، دنیا ہمیشہ مذہب کے بارہ میں بحث کرتی رہے گی۔ لیکن یہی کیوں فرض کر لیا جائے کہ ان مباحث کا منطقی نتیجہ "الحاد و بے دینی" کی صورت میں ظاہر ہوگا اور یہ کہ کیا یہ چیز ان پیشین گوئی کرنے والوں کا رسمی "فریب" (Fallacy) نہیں ہے؟

یقیناً یہ ایک حقیقت ہے اور ایسا نہ کرنا چاہئے۔ ہر پیشین گوئی کی سب سے بڑی کمزوری پیشینگو کی خود سری ہے وہ اپنے آپ کو اتنا عقلمند تصور کر لیتا ہے کہ جو کچھ میرے خیالات میں آنے والی نسل ان کو بے چون و چرا قبول کرے گی خصوصاً سیاسی و اقتصادی نظریات کا یہی حال ہے۔ چنانچہ کتابوں اور واعظوں کے لکچروں کو جب کوئی شخص دیکھتا اور سنتا ہے تو اُسے پتہ چلتا ہے کہ کیتھولک کو یہ یقین رہتا ہے کہ ساری دنیا اسی کی ہم خیال بن جائے گی، موحد کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ وقت آنے والا ہے جب وحدانیت تمام عالم کا ایمان بن جائے۔ بالآخر جارج برنارڈ شا آتا ہے اور وہ ان سب خیالات کو ٹھکرا کر ایک نئی بات کہتا ہے کہ مستقبل کا مذہب کیا ہوگا۔

الغرض ان معاملات میں صورت حال یکساں ہوتی ہے، پیشینگو کے دلایل بہت سادہ ہوتے ہیں وہ سمجھتا ہے

کہ حقیقت و صداقت سے میں ہی آشنا ہوں اور چونکہ تمام دنیا میری ہی طرح صداقت پرست ہونے والی ہے لہذا میری بتائی ہوئی صداقت کو ضرور تسلیم کیا جائے گا۔

مگر میں اپنے نظریہ کو اس طرح نہیں ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ مذہب، اپنی ہر شکل میں ایک دھوکا ہے، ایک وہم ہے اور میرا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی زندگی اور انسانی فطرت کے پاس وہ ذرائع و اختیارات موجود ہیں جن کو مذاہب عالم نے ہم میں بڑھنے سے روکا ہے اور جب یہ تمام مظالم اور تمام دھوکے ختم ہو جائیں گے اور جب انسان کو اپنی صحیح طاقت کا اندازہ ہو جائے گا تو ایک ایسا نظام تیار ہو جائے گا جو موجودہ نظام سے کہیں زیادہ خوشگوار اور دلکش ہو گا۔

میں یہ اس وجہ سے نہیں کہتا کہ میرا یہ عقیدہ مجھے اصل "صداقت" یا "حقیقت" معلوم ہوتا ہے بلکہ میں یہ اس واسطے کہتا ہوں کہ دنیا اسی سمت جا رہی ہے۔ آگے چل کر میں "مذہب" کی داستان مختصر الفاظ میں بیان کروں گا۔

تجربۂ سابق مذہب کی داستان کئی ہزار برس کی پرانی داستان ہے۔ اور مذہب کی ابتدا تلاش کرنے کے لئے ہم کو "عہد تجری" سے بھی قدیم تر زمانہ کی طرف نظر دوڑانی پڑتی ہے۔ لیکن یہاں کسی مدت پر بحث کرنا مقصود نہیں بلکہ مدعا صرف یہ کہنا ہے کہ اپنے ابتدائی دور ہی سے مذہبی خیالات میں تدریجی ارتقا ہوتا رہا ہے۔ اس ارتقا میں کوئی تحریک جذبات نہ شامل تھی بلکہ تفکر و واقعات کا ایک منطقی تسلسل تھا یا جیسا کہ اعتدال پسند مذہبی لوگ کہتے ہیں یہ ارتقا کسی بیرونی قوت کی طرف سے کوئی "الہام" نہیں ہے۔ اور اقوام عالم کی معیار عقل کے مطابق خدا نے اپنے آپ کو مختلف شکلوں میں ظاہر کیا ہے لیکن واقعات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہب پہلے ایک غیر مضرت رساں خیال تھا اور رفتہ رفتہ وہ بدتر ہوتا گیا۔

اگر تمام نسل انسانی برابر رفتار سے چلتی تو ہم آج مذہب کی ابتدا اور اس کے ارتقا کے بارہ میں کچھ نہ جانتے ہوتے مگر انسان نے اپنے تجربات صرف ۵-۶ ہزار برس پیشتر سے محفوظ رکھنا شروع کئے یہاں تک کہ فرضی داستانیں (Legends) بھی بہت پرانی نہیں ہیں۔ لیکن انسانوں کی یہ داستان ہر واقعہ سے اتنا متاثر ہوئی ہے کہ نسل انسانی کے مختلف حصوں نے عام ارتقا میں ہر منزل پر ترقی نہیں کی۔ بہر حال آج ہم دو انسانی سلسلے (Series) شمار کرا سکتے ہیں ایک تو ان "قبل تاریخ" (Pre-historic) قوموں کا سلسلہ جو لاکھوں برس پہلے گزری ہیں، دوسرے وحشیوں کا زمانہ یہ دونوں مدتیں تقریباً یکساں ہیں کیونکہ دونوں زمانہ قبل تاریخ (Pre-historic age) میں گزری ہیں اور ان قوموں کے خیالات سے تفکرات انسانی کے ارتقاء کے گزشتہ منازل ہم کو معلوم ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد تہذیب قدیم کے مذہب کا پتہ پرانی عمارتوں سے چلتا ہے اور پھر ادبیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے بارہ میں لوگوں کے کیا خیالات تھے۔ ادب سے گزشتہ تین ہزار برس قبل کے اس مذہبی ارتقا کا حال معلوم ہوتا ہے

جو مختلف مذہبی مرکزوں مثلاً چین، ہندوستان، ایران، یونان، روم اور مصر وغیرہ میں عیسائیت کے قبل پایا جاتا تھا اور جو سبق اس سے ہم کو ملتا ہے وہ اُس کے بالکل مطابق ہے جو اُس وقت سے اس وقت تک ہوتا رہا اور اب بھی ہو رہا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ ہر قسم کی آب و ہوا اور ہر قسم کی اقتصادی حالت میں مذہب کا ارتقا اتنا یکرنگ و یکساں رہا ہے کہ خود ایک مذہبی آدمی اس کا مستقبل دیکھ سکتا ہے، جن واقعات نے انسانی ترقی کو (ایسے ممالک میں جہاں ترقی کے وسایل تھے) روک دیا وہ لڑائیاں اور ایسی غلطیاں تھیں جو ہمیشہ تہذیب کو مٹاتی رہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ الحاد ہی زمانہ میں پھیلا جب تہذیب اپنے انتہائی عروج پر ہوئی اور جب تخریبی قوتوں نے علم کو مٹا دیا اور جہالت کا دور دورہ ہوا تو الحاد کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب علم کی ترقی ہوتی ہے تو مذہب کی بنیادیں کمزور ہو جاتی ہیں اور جب تہذیب مٹنے لگتی ہے تو اس میں پھر قوت آجاتی ہے۔

مذہب اور فطرت انسانی

میری رائے میں مذہب کی ابتدا کا حال بالکل ایسا ہی ہے جیسے پرانے زمانے کے حبشی کا تصور اپنے سایہ کے بارہ میں۔ میں نے دیکھا ہے کہ اگر کسی کتے کو عمر میں پہلی مرتبہ ژالہ باری سے سابقہ پڑے تو وہ بے انتہا حیرت زدہ ہو جاتا ہے یا اگر کوئی بلی پہلی مرتبہ کسی چھوٹے کو رینگتے ہوئے دیکھتی ہے تو وہ بہت متعجب ہو جاتی ہے۔ اسی طرح زمانۂ قدیم کے انسان میں ممکن ہے ایسے ردعمل (Reaction) ہوئے ہوں مگر ان کا مذہب سے اس وقت تک کوئی تعلق نہیں ہوا جب تک وہ یہ خیال نہیں کرنے لگا کہ جو چیز ان کا باعث ہے وہ ایک غیبی طاقت ہے۔

اسی طرح یہ نظریہ بھی غلط ہے کہ انسان نے پہلے ایک مبہم طاقت کا تصور کیا اور پھر یہی چیز شخصی روحوں (Personal Spirits) میں تبدیل ہو گئی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ روح کا سب سے پرانا نام "سایہ" (Shadow) ہے اور جب ہم اپنے آپ کو ایک قدیم وحشی کی جگہ دیکھتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ غالباً سایہ کے حیرت انگیز رویہ پر غور و فکر پہلی چیز تھی جس نے قدیم انسان کے دماغ میں تصور کی جھلک پیدا کی۔ اب سے سو برس قبل جب مشنریوں اور سیاحوں نے وحشیوں کے خیالات کا ریکارڈ رکھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے کسی کے خیالات اخلاق پر مبنی نہیں ہیں اور بعض کے تو مذہبی خیالات بھی نہیں ہیں۔ بعض "ہمزاد" یا "سایہ" پر یقین کرتے ہیں اور بعض انسان کے "دوسرے حصے" پر جو موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے کامل اعتقاد رکھتے معلوم ہوتے ہیں۔

دوسری منزل یا حیات بعد الموت کا خیال بھی تمام دنیا میں متوازی نظر آتا ہے یعنی یہ کہ مردوں کی روحیں زندہ رہتی ہیں اور ان کی سرگرمیاں زیادہ بڑھ جاتی ہیں نیز یہ کہ 'ارواح' بہت رنجیدہ اور خشک مزاج ہوتی ہیں گویا زندگی ترک کرنے سے ان کو تکلیف پہونچی ہے اس کا اظہار وہ خشونت سے کرتی ہیں یا یہ کہ چونکہ اب وہ کسی کو نظر نہیں آتیں اس لئے وہ ایسے کام کرنے لگی ہیں جو پہلے گوشت و پوست کی زندگی میں راز کھل جانے کے ڈر سے نہ کر سکتی تھیں۔ بہر حال وجہ

کچھ بھی ہو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر مذہب نے ایک وحشی کی زندگی کو کچھ عرصہ کے بعد تکلیف دہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ ان ارواح کو تمام بیماریوں اور مصیبتوں کا ذمہ دار سمجھا جانے لگا۔ اور چونکہ ہر آدمی کے مرنے کے بعد ایک خبیث روح بڑھتی ہے لہٰذا انسانی آبادیاں انھیں 'ارواح' سے معمور نظر آنے لگیں۔ بعد کو وہ زمانہ آیا جب ان ارواح کی نسبت خاص جگہیں (مثلاً آسمان، یا زمین) میں مقرر کر دی گئیں۔ ان میں سے بعض ایسی بھی سمجھی جانے لگیں جو آدمیوں کی مدد کرتی ہیں لیکن عام نظریہ یہی تھا کہ وہ عموماً شریر ہوتی ہیں۔

مذہبی "مقدسین" کا ظہور

مذہب کے اس ابتدائی دور پر زیادہ اظہار خیال کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم نے انھیں مختصر الفاظ میں ہزاروں برس کے مذہبی ارتقا کا حال لکھدیا ہے۔ اب مذہب کے ارتقا کی دوسری منزل کو لیجئے جس میں "پادری" یا "مذہبی عالم" کا ظہور ہوا ہے۔ یہ دور ہر حصۂ دنیا میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے گو وہ ہر جگہ مختلف شکلوں میں آیا ہو اور یہ جماعت گویا بُری روحوں سے مقابلہ کرنے کے لئے پیدا ہوئی تھی اور اس کی پوزیشن بھی ابتدا ہی سے عجیب و غریب تھی، ان "ارواحِ خبیثہ" کا مقابلہ کرنے میں مذہبی پیشواؤں کا طریق جنگ ایسا ہوتا تھا کہ بجز وحشیوں کے کوئی بھی اس پر ایمان نہیں لا سکتا تھا۔ وہ معمولی قسم کے 'ہپناٹزم' کی مدد سے کسی کو اچھا بھی کر سکتے تھے یا دشمن کو مار بھی سکتے تھے مگر اُن کے تمام کام محض اتفاقی واقعات کا نتیجہ ہوتے تھے۔

بہرحال جسوقت مذہبی "بزرگوں" کا یہ گروہ بڑھ رہا تھا اسی وقت مذہبی خیال میں بھی وسعت ہونی شروع ہوئی۔ انسانی افراد قبایل میں منقسم ہونے لگے اور ہر قبیلہ کا ایک سردار ہونے لگا۔ یہ سردار دوسری دنیا میں بھی سردار گنا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ انسان کی بڑھتی ہوئی قوت متخیلہ نے فطرت میں اور بھی کچھ طاقتور ہستیاں دیکھنا شروع کیں مثلاً سانپ، شیر وغیرہ اور آخر کار تمام نظام فطرت میں اُسے ارواح ہی ارواح نظر آنے لگیں، رفتہ رفتہ ان میں سے بعض "ارواح" دیوتا بن گئیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ مذہبی بزرگوں کی طاقت میں بھی اضافہ ہونے لگا یعنی جتنا بڑا دیوتا ہوتا تھا اتنا ہی عظیم المرتبت اس کا پوجاری ہوتا تھا اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ اگر کسی دیوتا کے پوجاری زیادہ طاقتور ہوئے تو انھوں نے اپنے دیوتا کو نہ صرف دوسروں سے بڑھکر ثابت کرنے کی کوشش کی بلکہ ان کو دوسرے دیوتاؤں کا یا تو سردار بنا دیا یا دوسروں کو شیطان ثابت کر دکھایا۔ مصر، بابل اور چین سبھی جگہ یہی ہوا۔

گناہ کا ثبوت

لیکن وہ ترقی بھی بہت اہم تھی جو ان حالات کے ساتھ ساتھ مذہبی و اخلاقی مفاد کے اتحاد پر قایم ہو رہی تھی ابھی تک مذہبی اور اخلاقی خیالات الگ الگ نشو و نما پا رہے تھے مگر اخلاقیات کا سبق اس وقت سے شروع ہوا جب لوگوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ ان کے قبائلی مراسم، ایک قانون ہیں جن پر عمل کرنا ضروری ہے۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ ان کے گزشتہ سرداران قوم جو بہت عقلمند تھے مرنے کے بعد دیکھ رہے ہونگے کہ ہمارے قبایلی قوانین پر ہمارے جانشین کہاں تک عمل کرتے ہیں۔ گویا مذہب یہیں سے 'خلاق' کی طرف متوجہ ہوتا ہے

۔اس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مذہب نے بہت جلد معلم اخلاقیات ہونے کی حیثیت حاصل کر لی لیکن تاریخ مذاہب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اسوقت تک اخلاقی نہیں ہوا جب تک اس کا معیار بہت اونچا نہیں ہوگیا۔ کہیں کہیں لوگ یہ خیال کر لیا کرتے تھے کہ ان کے دیوتا خرابیِ اخلاق سے ناراض ہوجاتے ہیں مگر زیادہ تر مذاہب میں اخلاقی عنصر نہیں پایا جاتا تھا۔ 'انصاف' ایک تمدنی چیز تھا یعنی اگر ایک آدمی، دوسرے کے ساتھ ناانصافی کرتا تو دوسرا اپنا انتقام لے سکتا تھا لیکن دیوتا عموماً کاہل ہوتے تھے جن کو ہر ہر بات میں چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا اور ان کی بہترین خدمت یہی سمجھی جاتی تھی کہ وہ اوپر اپنے تخت پر بیٹھے ہوئے اپنے بندوں کی قربانیوں کی خوشبو سونگھتے رہیں۔

شہوانی تعلقات سے بھی مذہب کو بہت عرصہ تک لگاؤ نہیں رہا۔ پرانی سوسائٹی میں ایک انسان کسی شہوانی غلطی کا مرتکب اُسی وقت سمجھا جاتا تھا جب وہ کسی دوسرے کی بیوی یا لڑکی کی عصمت خراب کرے اور اس کا یہ فعل صرف یہ حیثیت رکھتا تھا گویا ایک آدمی نے دوسرے آدمی کے مال کو چُرا لیا یا اس کو نقصان پہونچایا مگر تعداد ازدواج پھر بھی عام چیز تھی۔ عیسائی مبلغین کہتے ہیں کہ لوگوں کو گناہ کا خیال ہی نہیں ہوتا تھا اور یہ سچ ہے۔ ان کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ ہم اپنی روزی چاہے جس طرح پیدا کریں لیکن خدا ناراض نہ ہو اور نفسانی خواہشات کسی طرح پوری کریں تو وہ برہم ہوجائے۔ بہرحال نسل انسانی کا ایک حصہ سن عیسوی کی ابتدا تک اعضاء شہوانی کی پرستش کرتا رہا اور دوسرے حصہ کا مذہب اخلاقی رہا۔ ۶ ہزار برس قبل، جب مصر میں تہذیب کی ابتدا تھی، تو اسیرس (Osiris) مُردوں کا جج سمجھا جاتا تھا اور اُس کے قانون میں ناجایز شہوانی تعلقات کی سزا بہت سخت تھی۔ اسی طرح شہنشاہیت بابل کے زمانہ میں بھی زنا وغیرہ کی سخت سزائیں تھیں۔

غرضکہ گناہ کا خیال سن عیسوی کی ابتداء سے بہت قبل پیدا ہوگیا تھا۔ انسان کی داستان حسب ذیل پانچ حصوں میں منقسم ہوسکتی ہے۔ (۱) پتھر کے اوزار معلوم ہونے سے قبل لاکھوں برس پیشتر کا زمانہ (۲) پتھر کے زمانہ سے قبل تقریباً ۵ لاکھ برس پیشتر کا زمانہ (۳) پتھر کا زمانہ۔ (اب سے ۳۔۴ ہزار برس پیشتر کا زمانہ) (۴) نیا پتھر کا زمانہ (تقریباً ۲۰ ہزار برس قبل مسیح سے ۳۵۰۰ برس قبل مسیح تک) (۵) تاریخی زمانہ۔ مذہب کی خاص ترقی خاص طور سے نئے پتھر کے زمانہ سے ہونا شروع ہوئی ہے اور اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ مصر و بابل میں اخلاقی اور مذہبی خیالات پیدا ہونے شروع ہوگئے تھے۔

یہ ترقی بالکل قدرتی ترقی ہے۔ ایک طرف تو دیوتا تھے جو قوم کے اخلاق و عادات کی نگرانی کیا کرتے تھے دوسری طرف پادری یا مذہبی پیشوا تھے جو یہ ثابت کرتے تھے کہ خدا بدمعاشوں کو سزا دیتا ہے۔ بابلی یہ سمجھتے تھے کہ ہر مصیبت اور بیماری گناہوں کی پاداش ہے اور وہ اسوقت تک جاری رہے گی جب تک مذہبی پیشواؤں

کی وساطت سے، دیوتا گناہگار کو معاف نہ کردے۔ اسی طرح مصریوں کا یہ عقیدہ تھا کہ جب تک اسیرس معاف نہ کردے مرنے کے بعد گناہوں کی سخت سزا ملتی رہے گی۔ ایران میں یہ خیال تھا کہ مزدہ ایک دن تمام دنیا کو تباہ و برباد کردیگا عبرانیوں کا بھی اسی طرح کا عقیدہ تھا۔ یونانیوں کا مذہب جزوی طور سے اخلاقی ضرور تھا مگر (Old Testament) تحریر کئے جانے سے قبل ان کا بھی یہ خیال تھا کہ اگر روح گندی ہوجائے تو انسان کو حیات ابدی اُسوقت تک نہیں میسر ہوتی جب تک وہ توبہ اور بعض مراسم کی ادائی سے پاک نہ کی جائے۔

رہا یہ سوال کہ مذہبی و اخلاقی قوانین و خیالات کا اختلاط قوم کے لئے مفید تھا یا نہیں، سو اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ زیادہ مناسب یہ تھا کہ اخلاقی قانون پر مذہبی اثرات کے ماتحت عملدرآمد کرایا جائے اور ایک شخص کی اخلاقی حالت کے مطابق سزا و جزا دیجائے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ انسان اپنے عقاید کے ساتھ اپنے چال چلن کے باب میں جتنا زیادہ غیر منطقی رہا ہے اتنا اور کسی معاملہ میں نہیں رہا۔ کہا جاتا ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ میں عیسائی قوموں کے درمیان اخلاقی قوانین (خصوصاً جنسی تعلقات کے باب میں) بہت سخت تھے مگر پھر بھی ہمیں کوئی خطۂ بجز مشرقی بحر روم کے جہاں اعضائے شہوانی کی پرستش ہوتی تھی) ایسا نظر نہیں آیا جو زمانۂ وسطیٰ کی ان قوموں سے زیادہ خراب چال چلن رکھتا ہو اس لئے یہ نظریہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

گناہ کا خیال (جنسی تعلقات کے علاوہ) اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اخلاقی قانون کے مصنف دیوتا ہی ہیں مگر ایسے ثبوت کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ ان خیالات سے قوم یا نسل کی اخلاقی حالت کو کوئی فایدہ نہیں پہونچا۔ کنفوشش، بودھ، زیتور (Zoroaster) اور اپی کورس (Epicurus) سب نے ایسے اخلاق کا درس دیا جس میں خدا کا نام نہ تھا مگر پھر بھی اپنی قوم پر ان کا اتنا ہی اثر ہوا جتنا کسی اور مذہبی معلم اخلاق کا۔

ایک عیسائی جو اس مسئلہ پر بحث کرنا چاہے زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ گناہ کے مذہبی اور اخلاقی خیال نے جنسی تعلقات کو زیادہ خوشگوار بنا دیا۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے کیونکہ پانچویں صدی عیسوی سے اُنیسویں صدی عیسوی تک جنسی اخلاق بہت آزاد رہا ہے۔ جنسی تعلقات کے بارہ میں اخلاقی درس کی بنیاد کا پتہ زمانۂ ماقبل تاریخ میں ملتا ہے یعنی اُن اوہام میں جن سے ہم کو اب تنفر ہے۔

ایک اور خیال یہ تھا کہ دیوتا چاہتے ہیں کہ ان کے لئے قربانیاں کی جائیں اور جتنی زیادہ قیمتی قربانیاں کی جائیں گی اتنا ہی وہ خوش ہوں گے۔ در اصل یہ نہایت طفلانہ نظریہ ہے کہ دیوتا بھی اتنے ہی خودسر اور جابر ہوں جتنا ایک مطلق العنان اور ظالم بادشاہ۔ مگر پھر بھی یہ اصل ہے اُس دوشیزگی کی جس کی حضرت عیسیٰ نے تعریف کی ہے اور اُن مقدس قسموں کی جو راہب یا راہبہ آج بھی کیتھولک فرقہ میں کھایا کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اُس حصہ میں بھی (یعنی شامی علاقہ میں) جہاں گناہوں کا مرکز تھا اور جہاں زناکاری ایک قسم کی عبادت شمار کی جاتی تھی، ایک ایسے قسم کے زہاد اور اتقیاء کا دور دورہ

ہوا جو راہبوں کی پرہیزگاری سے بڑھکر تھا۔ چنانچہ سائبل (Cybele) کی پجارنیں اگر اپنے خوبصورت جسموں کو مندر میں پرستش کے لئے آنے والوں کے حوالہ کر دیا کرتی تھیں تو دوسری طرف پجاریوں کو بھی مجبوراً اتھین کا ٹکر مندر پر چڑھانے پڑتے تھے۔ گویا ایک ہی آسمانی رحمت کے سایہ میں انتہائی عیاشی اور انتہائی زہد و اتقا دونوں پروان چڑھ رہے تھے۔

بے دینی یا الحاد کا عروج

آخری اخلاقی، مذہبی، ترقی حضرت عیسےٰ کے ایک ہزار برس قبل ہوئی۔ یہ زمانہ تاریخ کے لئے بہت اہم شمار کیا جاتا ہے اور یہاں مذہب کی داستان نہایت اہم ہو جاتی ہے۔

ہر چند زمانہ تاریخ کے آغاز میں جب لوگوں کو لکھنا بھی آگیا تھا مذہب میں کئی خداؤں کے ماننے کا رواج پیدا ہو گیا تھا یعنی ہر قوم میں ارواح کے علاوہ دیوتا بھی کثیر تعداد میں پائے جاتے تھے اور ہر دیوتا کے الگ الگ پجاری اور مندر ہوا کرتے تھے اور ہر فرقہ کے مراسم بھی جداگانہ ہوتے تھے۔ لیکن حضرت عیسیٰ سے دو ہزار برس قبل ہی روحانی خدا کا عقیدہ پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ عبرانی پادری جنھوں نے پرانی انجیل (Old Testament) ایرانیوں اور بابلیوں کے اثرات کے ماتحت لکھی ہے اپنے مربی، بادشاہ سائرس (Cyrus) کو موحد مانتے ہیں قرطبی (Cretons) بھی ہزاروں برس سے موحد تھے اور صرف زمین کو اپنا دیوتا تسلیم کرتے تھے تعلیم یافتہ چینی بھی آسمان کو اپنا خدا مانتے تھے اور حضرت عیسیٰ سے پانچویں یا چھٹی صدی قبل جب یونانی فلاسفر ایک خدا کا ذکر کرتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ وحدانیت عام ہو چکی ہے

مگر اس ایک خدا کی نسبت بھی انکار اور الحاد کا دور اُسی وقت سے شروع ہو گیا جب سے علم میں اضافہ ہونے لگا۔ اور یونانی مفکرین نے بھی (بے دینی) پھیلانی شروع کی چنانچہ تھیلس (Thales)، اناکسی مندر (Anaxmander) دیاقرطیس (Democritus) وغیرہ کے نزدیک "خدا" صرف نام ہی نام ہے اسی طرح تیسری صدی قبل مسیح کے اسٹوئک (Stoics) اور اپیکورین (Epicurean) طبقے پورے مادہ پرست تھے

اب ذرا غور سے دیکھئے۔ مصر میں حضرت عیسیٰ سے ایک ہزار برس قبل زوال کے آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے، اس کی علمی ترقی ختم ہو گئی اور وہاں بہت پرانے پرانے اور نئے نئے مذہب پیدا ہونے لگے۔ بابل کو اسی زمانہ میں اسیریا (Assyria) نے تباہ کر دیا تھا مگر ہندوستان اور چین نے اپنی اپنی تہذیب قایم رکھی اور اپنے الحاد سے تمام تعلیم یافتہ طبقہ کو منسلک کر لیا۔ البتہ ہندوستان میں ایک جبلا ردِ عمل ہوا اور گوتم بدھ نے جو تعلیم دی تھی وہ کالعدم ہو گئی چین کے اعلیٰ طبقہ میں مذہب نے کبھی اقتدار نہیں حاصل کیا اور یہ اثر جاپان تک پھیلا جہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی بے دینوں میں شامل ہے۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جہاں کہیں آزادیٔ خیال لوگوں کو نصیب تھی وہاں مذہب، خواہ وہ وحدانیت

ہی کا کیوں نہ قایل ہو، بے دینی میں بدلنے لگتا تھا۔ یونانیوں کے تجربات اولیں سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ ان لوگوں میں تحصیل علم و اشاعت علم کا اسقدر شوق تھا کہ انھوں نے تین صدیوں میں سائنس اور فلسفہ کی اتنی اشاعت کی کہ مصر اور بابل تین ہزار برس میں بھی نہ کر سکتے تھے۔ اور یہ سب کے سب "بے دین" یا "منکر دین" تھے۔ ہمارے پاس ان کی کتابیں موجود نہیں ہیں مگر بعد کے یونانیوں نے ان کے باب میں جو کچھ لکھا ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بالکل مادہ پرست تھے اور انکی کائنات مادی کائنات تھی! اس کے بعد یونان کی حالت دیکھئے جب وہاں کی تمام ریاستوں میں (بجز اسپارٹا کے) جمہوریت تھی اور ساری طاقت جاہل عوام کے ہاتھوں میں تھی۔ اسوقت وہاں ایک خاص مذہبی تقشف کی لہر دوڑ گئی اور مفکرین کو بہت اذیتیں برداشت کرنا پڑیں حتیٰ کہ سقراط کو بھی جو خدا پرست تھا جان دینا پڑی اور فلاطون کی بھی کسی نے نہیں سنی مگر جب دوبارہ علم کی اشاعت ہوئی تو پھر بے دینی میں ترقی شروع ہوئی اس کے بعد آخری زوال سے کچھ ہی زمانہ قبل جب ایتھنس میں تہذیب اپنے عروج پر تھی، تو مذہب حتیٰ کہ فلاطون کی عقلی خدا پرستی کا بھی زوال ہو چکا تھا۔ اس کے بعد یونان کی تہذیب، اسکندریہ کی طرف منتقل ہو گئی اور گو اسکندریہ کے ماہرین سائنس و ماہرین ریاضی کے خیالات سے کم واقف ہیں مگر ہمارے پاس یہ یقین کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ وہ بھی عموماً بے دین اور منکر تھے۔ اس کے بعد تہذیب، روم میں پہونچی اور وہاں اگرچہ عوام مذہب کے پیرو تھے مگر تعلیم یافتہ طبقہ میں وہی بے دینی پائی جاتی تھی جو یونانی کو اس کے الحاد اور اسٹوئک اخلاقیات سے ملکر پیدا ہوئی تھی۔

الغرض ایک ہزار سال کی مدت جو ۶۰۰ برس قبل مسیح سے شروع ہو کر ۴۰۰ برس بعد مسیح تک جاری رہتی ہے اور جس پر "پرانی دنیا" کا اختتام سمجھا جاتا ہے تاریخی اہمیت سے بھری ہے۔ ابھی تک علم صرف پادریوں اور پجاریوں تک محدود تھا اور مندر، اور عبادتگاہوں کے لئے حاصل کیا جاتا تھا۔ البتہ بابل، علم نجوم میں ترقی کر رہے تھے مگر اس کے بعد دنیا کے حصہ میں مثلاً چین، ہندوستان، ایران، یونان، مصر اور روم) مفکر اور معلم اخلاق پیدا ہونے لگے اور الحاد کا پھر عروج ہو گیا۔ فیثاغورث اور فلاطون وغیرہ چند مفکرین نے مذہب کو بے دینی کی اس رَو سے بچانا چاہا مگر ان کا اثر زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوا۔ سن عیسوی کی ابتدا کے وقت تعلیم یافتہ لوگ عموماً بے دین تھے اور اس میں شک نہیں کہ اگر مغربی تہذیب مٹ نہ گئی ہوتی تو تعلیم یافتہ طبقہ، چین اور جاپان والوں کی طرح مستقل طور سے بے دین ہو جاتا۔

خود دور آخریں کا تجربہ ثابت کرتا ہے کہ طبقۂ اوسط کی تہذیب کی وسعت گویا بے دینی کی وسعت تھی۔ رومنوں نے عوام میں تعلیم پھیلانی شروع کر دی تھی۔ ابتدائی تعلیم اور مدرسے ہر شخص کے لئے عام تھے، اکثر کو ثانوی تعلیم دینے کی کوشش کی جاتی تھی اور چند کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں بھی مدد دینے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اگر یہی سلسلہ جاری رہتا تو مذہب بے دینی پر جا کر ختم ہو جاتا مگر بدقسمتی سے اُس کے بعد ۱۵۰۰ سو برس تک ایک ایسا زمانہ گزرا جب "کلچر" دفن کر دیا گیا تھا، غور و فکر کی آزادی سلب کر لی گئی تھی، اور انسانی دماغ کو معمولی کام کرنے سے بھی روک دیا گیا تھا۔

عیسائیت کی سچی داستان

یہ پندرہ سو برس کی مدت وہی ہے جسے 'عہد عیسویت' کہا جاتا ہے یعنی چوتھی صدی عیسوی کے نصف آخر سے (جب یورپ میں عیسائیت یہ جبراً پھیلائی گئی) انیسویں صدی کے نصف آخر تک (جب آزادیٔ عقاید مل گئی تھی، سائنس کی اشاعت ہونے لگی تھی، عوام کو تعلیم دیجانے لگی تھی اور عیسویت اکثریت کے مذہب کی حیثیت سے ختم ہو چکی تھی) یہ وہ عہد تھا جب یورپ و امریکہ میں عظیم الشان اکثریت کا مذہب عیسائیت تھا۔

صاحبان کلچر باہم گرچہ بہت مختلف ہو سکتے ہیں اور یہ اختلاف، علمی و جذباتی دونوں طرح کا ہو سکتا ہے۔ ایک شخص کسی معاملہ کا بہت بڑا ماہر ہو سکتا ہے مگر ساتھ ہی مذہبی مسایل میں اس کی معلومات بہت ہی ناقص ہو سکتی ہیں۔ ایک آدمی خاص علم کے باب میں ایک زبردست نقاد بن سکتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ مذہب کے متعلق بھی انتقادی اہلیت رکھتا ہو۔

غرضکہ دو ہزار برس پیشتر بھی مختلف اسکول پائے جاتے تھے۔ ایک ایپیکورین جو روحانیت یا مذہب کے خیالات کو پس پشت ڈال کر انسانی مسایل کو انسانی نگاہ سے دیکھتا تھا اور دوسرا متصوفانہ (جس میں فیثاغورث، فلاطون، مارکس وغیرہ شامل تھے)۔ دوسرے قسم کے مفکرین نئے مذاہب چاہتے تھے چنانچہ کئی مذاہب قایم بھی ہو گئے۔ حضرت عیسیٰ نے سب سے پہلے یہ "روحانی" تعلیم دی کہ عیش و عشرت سے نفرت کی جائے اور گناہ سے خوف کیا جائے یہ نظریہ عیسیٰ کی پیدائش سے بہت قبل تمام دنیا میں پھیل چکا تھا اور سقراط، فیثاغورث، فلاطون، زینو اور مصر و ایران وغیرہ کے متعدد مفکرین کی بھی تقریباً یہی تعلیم تھی۔ حتی کہ سائبل (محبت کی ایک دیوی) کا بظاہر شہوت پرست مذہب بھی اپنے پادریوں (مذہبی پیشواؤں) کو خصی ہو جانے پر مجبور کرتا تھا۔

پہلی صدی قبل مسیح کی یونانی، مصری، رومنی، دنیا اسی قسم کی روحانیت سے بھری تھی اس کے بعد عیسیٰ کے ماننے والوں کو تاریخ کے صفحات پر اُس وقت تک آنے کا کوئی امکان نہ تھا جب تک پال (Paul) نے عیسیٰ کو خدا نہیں بنا دیا اور ان کی موت کے افسانے تیار نہیں کر دئے۔ اس کے بعد یونانی عیسائیوں نے عیسیٰ کی ایسی سوانحعمریاں لکھنی شروع کیں جن میں مختلف مذاہب کے توہمات اور فرضی افسانے حضرت عیسیٰ سے منسوب کر دئے گئے اور اس صورت سے جو نیا مذہب تیار ہوا وہ یونان کے خیالات کا ایک مجموعہ تھا۔ اس نئے تیار شدہ مذہب میں ایک بھی اخلاقی خیال ایسا نہ تھا جو 'اریجنل' ہو کیونکہ اس طرح کے افسانے اس وقت کے تمام مذاہب میں عام طور سے پائے جاتے تھے اور اس لحاظ سے حضرت عیسیٰ کی تصویر تموز (Tammuz) اسیرس (Osiris) اڈونس (Adonis) وغیرہ کی روایات سے لی گئی تھی۔

مگر پھر بھی یہ نیا مذہب تین سو برس تک یونانی۔ رومنی دنیا میں کوئی اہمیت نہ حاصل کر سکا۔ البتہ اُس میں

ایک خاص بات یہ ضرور پیدا ہو گئی کہ حضرت عیسیٰ کے مفروضہ احکام اور مشن کے خلاف پادریوں نے مخصوص اُصول مذہب (Dogmas) پیدا کر لئے۔ تاہم ۵۰۰ عیسوی تک وہ اپنے حلقہ میں ۱۰ لاکھ سے زیادہ حلقہ بگوش پیدا نہ کر سکے اور اب گزشتہ نصف صدی میں وہ دس کروڑ عقیدتمندوں سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ عیسوی کی یہ داستانیں کہ عیسائیوں کا متعدد مرتبہ قتل عام ہوا یہ بھی اب غلط سمجھی جاتی ہیں اور تعلیم یافتہ لوگ ان قصوں کو نہیں مانتے۔ صرف چند سو آدمیوں کے قتل کا حال بیشک تاریخ سے ثابت ہوتا ہے ورنہ باقی افسانہ ہی افسانہ ہے۔

سب سے بڑا اور خاص "قتل عام" تیسری صدی عیسوی میں ہوا تھا جب عیسائیوں نے شہنشاہ روم سے گستاخی کی تھی اور سلطنت روم کی طرف سے جنگ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جب یہ "قتل عام" شروع ہوا تو اُسوقت عیسائیوں کے صرف دو گرجے تھے اور تمام روم میں ان کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہ تھی، ان کے علاوہ کچھ مغربی یورپ میں بھی پائے جاتے تھے۔ چنانچہ اس سزائے عام میں کچھ لوگ تو اٹلی کے مارے گئے، اور کچھ دوسرے حصوں کے لیکن روم کے چند ہزار عیسائیوں کی اکثریت نے اپنا مذہب بدل دینا منظور کر لیا۔ اور جب چوتھی صدی کا آغاز ہوا تو عیسائیت کی حالت نہایت ذلیل و خوار تھی۔ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ مسلمان تو دو سو برس میں تین تہذیبوں کے مالک ہو گئے اور عیسائیت تین سو برس کے بعد بھی دیوالیہ ہی رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ مذہبی لٹریچر میں تاریخ کا حصہ انتہائی کذب بیانی پر مشتمل ہے۔ خیر۔ اس کے بعد شہنشاہ قسطنطین نے جو ایک رومن افسر اور شرابخانہ کی ایک فاحشہ عورت کا لڑکا تھا جنگ کر کے تخت سلطنت حاصل کیا اور اس نئے مذہب کی سرپرستی کرنے لگا۔ یہ سوال کہ خود اس نے اس مذہب کو کہاں تک قبول کیا متنازع فیہ ہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ اُس نے اس مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ مراعات کیں، اس مذہب کو قبول کرنے والوں کی ہمت افزائی کی اور اپنے لڑکوں اور جانشینوں کو عیسویت کی تعلیم دی لیکن ۸۰ برس کے شاہی اثرات اور مشرق میں جور و ظلم کے باوجود عیسائیت صرف اقلیت تک محدود رہی اور روم کے تقریباً تمام امراء "کافر" ہی رہے۔ آخر کار قیصران روم کو اس پر آمادہ کیا گیا کہ وہ تمام روم کو بہ جبر عیسائی بنائیں۔ چنانچہ اس طرح اور صرف اسی طرح، صلیب نے اپنے حریفوں کے معبدوں کھنڈروں پر فتح حاصل کی! اور یہ ایسے تاریخی واقعات ہیں جن سے انکار ممکن نہیں۔

دوسری تاریخی غلطی کی تصحیح یہ ہے کہ عیسائیت کے پھیلنے کے بعد اخلاقیات میں کوئی ترقی نہیں ہوئی بلکہ ۱۰ برس کے اندر اندر یورپ میں زمانۂ جاہلیت کی یاد پھر تازہ ہو گئی تھی۔ یہ امر حقیقت کے بالکل منافی ہے کہ عیسائیت نے اسکول قائم کرائے، غلاموں کو آزاد کرایا، عورتوں کے رتبہ میں اضافہ کیا یا خیرات اور رحم و کرم کے دور کا آغاز کیا۔ دراصل عیسائیت نے اس کے بالکل برعکس کیا۔ اس نے اسکولوں کا خاتمہ کر دیا، عورتوں کو ذلیل و خوار کر دیا، "کافر" رومنوں کی فیاضیوں کو ملیامیٹ کر دیا اور نفس پرستی اور ظلم و جفا کی سرپرستی کی۔

عیسائیت کے طرفدار کہتے ہیں کہ تہذیب کی بربادی گوتھ اور ونڈال اقوام نے کی نہ کہ عیسویت نے۔ لیکن جو مورخ ہیں وہ اس عذر لاطایل کی مطلق وقعت نہیں کرتے کیونکہ شہادتیں اس کے برعکس پائی جاتی ہیں۔ یونان کی عیسائی مملکت پر کبھی ان وحشی قبایل نے حملہ نہیں کیا مگر پھر بھی اُس نے کوئی ترقی نہ کی اور بداخلاقیوں ہی میں پڑی رہی۔ خود سلطنت روما کے مغربی حصہ میں یہ "وحشی" اتنے درندہ اور بدتہذیب نہ تھے جتنا ان کو پیش کیا جاتا ہے۔ تھیوڈرک (Theodoric) اور شارلمین (Charlemagne) نے تہذیب میں اضافہ کرنا چاہا تھا مگر پادریوں نے صرف یہی نہیں کہ اس کی امداد نہ کی بلکہ اُس کی ساری اسکیم کو ناکامیاب کر دیا۔ دوسری طرف مذہب اسلام کی ایک خام پیداوار یعنی عربوں نے جو قوم ٹیوٹن (Teuton) ہی کی طرح شدت پسند اور جاہل تھی یونانی اور ایرانی کلچر کو حاصل بھی کیا اور خود اپنی شاندار تہذیب کو رواج دیا۔ لیکن اس کے بالکل برخلاف عیسائیت چھ صدی تک جہالت درندگی اور وحشت کا ایک مجموعہ رہی اور بحیثیت مجموعی یورپ کی براعمالیوں، بدعنوانیوں اور جہالت کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سائنس ختم ہو چکی تھی اور سو میں ایک تنفس بھی تعلیم یافتہ نہ تھا۔ فنون لطیفہ، (بجز ایک قلیل مدت کے جب کہ جرمنی میں فن تعمیر سازی میں کچھ ترقی ہوئی تھی) بارھویں صدی تک گوشۂ گمنامی میں پڑے رہے۔ بارھویں صدی تک مشکل سے کوئی اسکول یا لائبریری دکھائی پڑتی تھی۔ شہروں کی آبادی ۲۰ ہزار سے زیادہ کی نہ ہوئی تھی اور بڑے سے بڑے قصبہ میں صفائی کا مطلق انتظام نہ تھا۔ انصاف کے ساتھ مذاق کیا جاتا تھا اور سزائیں انتہائی وحشیانہ ہوتی تھیں اور افسوس تو یہ ہے کہ گوتھ اور ونڈال کی تاراج کردہ زمین کو عیسائیت نے اس قابل بھی نہ بنایا کہ اس میں ایک پھول بھی نکل آتا۔ تاریخ، عیسائیت کے اس دعوائے بے دلیل پر ہنستی ہے کہ اس کے مذہب میں تہذیب کا عنصر موجود تھا عیسائیت کو تہذیب کی اشاعت کے لئے دوسرے مذاہب سے زیادہ موقع تھے مگر اس علمبردارانہ تہذیب نے دنیا کو غیر مہذب ہی رکھا!

تہذیب کی تجدید

اس کے بعد بارھویں صدی سے یورپ میں تہذیب از سر نو قائم ہونے لگی۔ بارھویں صدی، اس لئے کہا گیا ہے کہ یہیں سے تہذیب یورپ میں کئی چیزوں کی ابتدا ہوتی ہے مثلاً گوتھک آرٹ، کی ابتدا، یونیورسٹیوں کا قیام، تجارت کی ترقی، بڑے بڑے شہروں کا وجود، غلاموں کی آزادی وغیرہ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ نہ فراموش کر دینا چاہیئے، ہر چند عہد وسطیٰ در اصل انیسویں صدی تک قایم رہا، لیکن تہذیب یورپ کی حالت بارھویں صدی ہی سے در اصل سنبھلنا شروع ہو گئی تھی۔ اور جو کچھ اصلاحات ہوئیں وہ یا تو عیسائیت سے قطعاً بے نیاز ہو کر ہوئیں یا اُس کے علی الرغم۔ مگر حیرت انگیز امر یہ ہے کہ تہذیب یورپ کی تمام تاریخ محض "چرچ" (پادریوں) کو خوش کرنے کے لئے بدل دی گئی ہے، حالانکہ عہد وسطیٰ میں فنون لطیفہ کی ترقی (جس پر "چرچ" فخر کرتا ہے) اس وجہ سے ہوئی کہ صاحبان آرٹ نے پرانے معیار کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ غلاموں کی آزادی اقتصادی

ومعاشرتی وجوہ کی بنا پر ہوئی اور پادریوں کا طبقہ ہی وہ طبقہ تھا جس نے اس پالیسی پر سب سے آخر میں عمل کیا۔ عملی زندگی کا احیاء اور دوسرے فنون کی ترقی اسپین میں مسلمانوں کی شاندار تہذیب کی بدولت ہوئی اور اُس بنیاد پر جس پر پوپ کے اثرات نے یورپ کے کسی ملک میں کوئی عمارت نہیں قایم کی تھی! سپین میں عربوں نے ایک صدی کے اندر تہذیب کا ایک لاجواب معیار قایم کر دیا تھا۔ غرضکہ یورپ میں سائنس کی اشاعت مسلمانوں کی بدولت شروع ہوئی مگر عیسائی پادریوں نے ان حیرت انگیز ترقیوں کو آیندہ تین صدیوں تک ملتوی رکھا۔ یورپ میں تہذیب کی از سر نو پیدائش میں یونانی لٹریچر کو جو حصہ دیا گیا ہے وہ بھی بہت بڑی حد تک مبالغہ آمیز ہے۔ اس تہذیب کا سب سے بڑا باعث اسپین کے "مور" (مسلمانوں اور سسلی کے عرب ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یونانی اور لاطینی کتابوں نے اٹلی، فرانس اور انگلستان میں تعلیم یافتہ طبقہ کے خیالات سدھارنے میں بہت مدد کی۔

عیسائیت کا طرفدار اکثر اپنے مذہب کی حمایت میں کسی خانقاہ، یا کسی پادری، یا کسی لائبریری کا (جو کہیں کہیں ایک آدھ صدی میں دکھائی پڑتی ہیں) نام لیتا ہے اور بڑے فخر سے کہتا ہے کہ دیکھو یہ سب مذہب کی برکت ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک دو صدی میں کسی ایک پادری کا کوئی فعل یا کسی ایک لائبریری کا قیام مذہب کی حقانیت کو نہیں ظاہر کرتا بلکہ "عیسائی چرچ" کی پالیسی اس کے پادریوں، اسقفوں اور پاپاؤں کی اکثریت کے افعال سے ظاہر ہوتی ہے اور یہ پالیسی انسانیت کے نقطۂ نگاہ سے انتہائی مہلک رہی ہے۔ پاپاؤں اور پادریوں کی کثیر تعداد ہمیشہ خودغرض اور اخلاقی اعتبار سے نہایت نفس پرست رہی۔ غرضکہ یورپ میں جن چیزوں نے تہذیب کے پھیلانے میں امداد دی ان میں مذہب کا ہاتھ بالکل نہیں اور جس قسم کی بھی یورپ میں ترقی ہوئی اس میں عیسائیت ذرا بھی ممد و معاون نہیں ہوئی۔ "اصلاح مذہب" کی تحریک جس نے پاپائے روم کی طاقت کو صدمہ پہونچایا البتہ ایک مذہبی خدمت تھی مگر اس 'اصلاح' نے بھی ایک ایسی خانہ جنگی کی بنیاد ڈالی جس کا اثر عرصہ تک قایم رہا اور انقلاب فرانس تک نہ زایل ہو سکا البتہ اس کے بعد یورپ میں جب دماغی اصلاح، شروع ہوئی تو وہ صرف اس نظریہ کی بدولت کہ "علم" مذہب کے لئے مہلک ہے اور ترقی تہذیب سے مراد ہے لامذہبیت کی ترقی" اور اس تمام مدت میں جہالت اور شایستگی یا نور و نار میں برابر جنگ ہوتی رہی۔ مشرقی یورپ میں "افکار عقائد" نویں صدی ہی سے پھیلنے لگا تھا حتی کہ ملکہ تھیوڈورا نے اسی صدی میں پال کے ایک لاکھ معتقدین کو ہلاک کرا دیا اور دسویں صدی میں ایک اور بادشاہ نے ان کے ۲ لاکھ آدمیوں کو بلگیریا کے ویرانوں میں جلاوطن کر دیا۔ یہ لوگ اگرچہ "انجیل نو" کو مانتے تھے مگر چونکہ ان کے اعتقادات بظاہر مذہب مانوی پر مبنی تھی اس لئے ان کی تحریک دراصل عیسائیت کے خلاف ایک تحریک تھی۔ اس کے علاوہ اطالوی شہروں میں بھی مسلمان عربوں کے اثر کی وجہ سے ایک قسم کی مہذب بے دینی عام ہو چلی تھی۔ پاپائیت نے ان منکرین کی خون کی ندیاں بہا دیں مگر پھر بھی یہ تحریک لوتھر کے زمانہ تک چلتی رہی۔ اس کے بعد اسی سلسلہ میں لوسی فر کا فرقہ پیدا ہوا اور کئی

زبردست بلوے بھی ہوئے جن میں لاکھوں آدمیوں کی جانیں کام آئیں۔ قصہ مختصر یہ کہ نشاۃ الثانیہ کی پوری مدت میں پایۂ ثبوت نے تقریباً دس لاکھ سے زیادہ آدمیوں کی جانیں لیں اور لاکھوں کو مختلف صعوبتوں میں مبتلا رکھا۔ اور اگر مذہبی جنگوں کے مقتولین بھی شامل کر لئے جائیں تو ان "شہداء" کی تعداد نہ معلوم کتنی لاکھ ہو جائے ــــ!

یورپ کی تاریخ ان واقعات کی تصدیق کرتی ہے اور یہ امر پایۂ تحقیق کو پہونچ جاتا ہے، جیسے جیسے علم میں ترقی ہوئی ویسے ہی انکار مذہب میں ترقی ہوئی حتیٰ کہ موجودہ زمانہ کی ترقی تعلیم نے اس بے دینی یا انکار مذہب میں اور زیادہ اضافہ کر دیا اور جس قانون کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ دنیا کے اُس سرے سے اِس سرے تک صحیح ثابت ہوتا چلا آیا ہے

مستقبل کی لامذہبیت

اس مضمون سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ مذہب کے مستقبل کے بارہ میں کوئی پیشینگوئی کسی مخصوص آدمی کی رائے پر منحصر نہیں ہے بلکہ ہم کو وہ قانون معلوم ہو گیا ہے جو ہر زمانہ میں سچا ثابت ہوتا چلا آرہا ہے، یہ سوال البتہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر علم کا نتیجہ 'الحاد' ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ اتنے تعلیم یافتہ لوگ مذہب کو اب بھی مانتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ عوام کے مذاہب کا ارتقاء وحدانیت اور پھر بے دینی ہے، دنیا، جسمانی حیثیت سے ایک منزل سے دوسری منزل تک نہیں جاتی ہے اور تعلیم یافتہ آدمیوں میں بھی مزاج کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ عیسائی ہے یعنی حضرت عیسیٰ کا مداح۔ دوسرا حضرت عیسیٰ کی مدح کرنے کے باوجود اپنے آپ کو عیسائی کہنے سے اُس حالت میں گریز کرے گا جبکہ وہ عیسائی مذہب کو نہیں پسند کرتا۔ ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ وہ خدا پر ایمان رکھتا ہے اور دوسرا کہہ سکتا ہے کہ اس کا خدا پر کوئی اعتقاد نہیں مگر پھر بھی ایک 'عالمگیر قوت' کا دونوں کو احساس ہو سکتا ہے ایک آدمی مختلف علوم کا ماہر ہو سکتا ہے مگر اس کا بھی امکان ہے کہ اُس نے مذہب پر کبھی غور نہ کیا ہو،

بہرحال یہ طے شدہ امر ہے کہ مذہب بحیثیت ایک مجموعۂ عقاید کے تعلیم یافتہ طبقہ سے اپنا اثر زایل کرتا جا رہا ہے اور چونکہ آج کل تعلیم عام ہو چلی ہے اس لئے یہ بھی صحیح ہے کہ گویا عوام پر سے اُس کا اثر زایل ہو رہا ہے۔ یہ مسئلہ مذہب میں اصلاح کرنے کا نہیں ہے کیونکہ اگر اس نظریہ کو مان لیا جائے تو پیغمبروں پر حرف آتا ہے۔ نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُصول مذہب سے انکار کر کے صرف اخلاقیات کو مانا جائے کیونکہ اس نظریہ کو ایک قلیل اقلیت کے علاوہ اور کوئی تسلیم کریگا اور ان سب کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مذہب کا زوال یقینی ہے۔

اسی کے ساتھ ان واقعات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خدا پرستی کا زوال بھی لازمی ہے، ہم دیکھ رہے ہیں کہ گزشتہ ۵۰ برس سے وحدانیت کس طرح اپنی جگہ پر قایم ہے اور الحاد کتنا پھیل رہا ہے۔ لہٰذا اب جبکہ علم عام ہو رہا ہے مستقبل کا حال ظاہر ہے۔ خدا کے خیال کو اب خواہ کتنا ہی پاکیزہ کیوں نہ بنایا جائے، مگر وہ باقی نہیں رہ سکتا گزشتہ نصف صدی میں کئی مذاہب پیدا ہوئے اور ان کے معتقدین کی تعداد بڑھانے کی بہت کوشش

کی گئی مگر پھر بھی ان کے پیرووں کی تعداد میں ۲۰ لاکھ سے زیادہ اضافہ نہیں ہوا حالانکہ ۲۰ کروڑ آدمی ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو مذہب سے بالکل بے پروا ہیں۔ درانحالیکہ ہمارے نصاب تعلیم میں مذہب پر خاص زور دیا جاتا ہے کہ بہرحال مذہب کا خاتمہ اب کچھ مدت کی بات ہے!۔ اس کے ساتھ ہی ذرا اس صورت حال پر نظر ڈالئے کہ (صرف عیسائی ممالک میں) مبلغین مذہب کی تعداد تقریباً ۵ لاکھ ہے کہ ان کے مقابلہ میں بے دینی پھیلانے والے ۵۰۰ کے تناسب سے زیادہ نہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ مذہب کی طرف سے کروڑوں روپیہ بھی ہر سال خرچ ہوتا ہے۔ کیا اس حالت پر غور کرنے کے بعد بھی مذہب کے مستقبل کے متعلق کوئی شک باقی رہ جاتا ہے!۔ تعلیم یافتہ ممالک میں تو مذہب تقریباً ختم ہو گیا ہے البتہ جاہل ملکوں میں اکثریت مذہب کی پابند ہے مگر وہ بھی اُسوقت تک اُسے مانتی رہے گی جب تک وہاں تعلیم عام نہیں ہوئی۔ اب یہ سوال کہ تعلیم کب عام ہوگی، اس کا ابھی جواب نہیں دیا جا سکتا، بہرحال کچھ بھی ہو، اس صدی کے آخر میں اگر کہیں مذہب قایم بھی رہا تو وہ انتہائی نفرت خیز چیز ہوگی۔

یاد رکھئے کہ مذہب کا خاتمہ وہ مبارک گھڑی ہوگی جب ہم مردہ انسانوں سے مدد مانگنے کے بجائے اپنی عقل سے امداد کے طالب ہوں گے اور ہم میں ایک ایسی زندگی پیدا ہو جائے گی جو تمام زندگیوں سے لطیف تر، خوشگوار تر اور مرغوب تر ہوگی!!!

تمام وہ اصحاب

جنھوں نے مجموعہ استفسار کی پہلی دو جلدیں خریدی ہیں

براہ کرم نوٹ فرمالیں کہ تیسری و آخری جلد شایع ہونے کے بعد دو روپیہ رعایت قیمتی پر (علاوہ محصول) ان کے نام غالباً اخیر اکتوبر میں زریعہ وی۔پی روانہ کر دی جائیگی اگر اس دوران میں انکی ممانعت کا خط نہ آگیا۔

یہ عبارت نہ صرف خریداران نگار کے علمی و ادبی ذوق کے بنا پر کی جاتی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ پہلی دو جلدیں بغیر تیسری جلد کے زیادہ مفید نہیں ہو سکتیں اور ہر شخص پورا سٹ ہی رکھنا پسند کرے گا۔

مینجر "نگار"

مجنوں

(بہ سلسلۂ ماسبق)

مدت دراز کے تمدن نے انسانی جذبات کو نہایت لطیف اور زوردار بنا دیا ہے، اس لئے ذرا سی تحریک سے یہ شعلہ بھڑک اُٹھتا ہے اور دل و دماغ کو آتش فشاں بنا دیتا ہے۔

مجنوں اپنے والد کے ساتھ خیف اور منیٰ کے درمیان سے گزر رہا تھا کہ کسی نے کسی اور لڑکی کو جس کا نام بھی "لیلیٰ" تھا "یا لیلیٰ" کہکر پکارا، یہ پیارا نام سنتے ہی مجنوں بیہوش ہو کر گر پڑا، جب ذرا حواس درست ہوئے تو اُس نے کہا:۔

۱۔ وداع دعا اذ نحن بالخیف من منیً فہیج احزان الفواد و ما یدری،	جب میں خیف اور منیٰ کے درمیان تھا تو کسی نے آواز دی اور میرے دلی رنج کو اُسنے برانگیختہ کر دیا درانحالیکہ وہ اس سے واقف نہ تھا۔
۲۔ دعا باسم لیلی غیر ھا فکانما، اطار بلبی طائراً کان فی صدری،	اُس نے کسی اور لیلیٰ کا نام لیکر پکارا لیکن اُس نے گویا میرے طائر عقل کو اُڑا دیا۔
۳۔ دعا باسم لیلی اُسخن اللہ عینہ ولیلی بارض الشام فی بلد قفرِ	خدا اُس کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچائے اُس نے لیلیٰ کا نام لیکر پکارا جبکہ لیلیٰ ملک شام میں تھی۔
۴۔ عرضت علی قلبی العزاء فقال لی من الآن فاجزع لا تملک من الصبر	میرے دل رنجور پر تو نے اُس کی یاد تازہ کر دی، پس دل نے مجھ سے کہا اب آہ و زاری کر اور صبر سے ملول مت ہو۔
۵۔ اذا بان من تہوی وشطّ بہ النوی ففرقتہ من تہوی احرّ من الجمر،	جب وہ جدا ہو جس سے تو محبت کرتا ہے اور جدائی تفریق پیدا کر دے تو محبوبہ کی جدائی انگارے پر لوٹنے سے زیادہ سخت ہے۔

محبت کے دعویٰ میں چونکہ عاشق کو مزہ آتا ہے، اس لئے طرح طرح سے اُسے ادا کرتا ہے، کبھی معشوق کو مخاطب بناتا ہے اور مختلف پر اثر طریقوں سے اُس کو اپنی شیفتگی اور وفاشعاری، جانبازی اور جاں نثاری کا یقین دلاتا ہے کبھی اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے اور کبھی اس سے، یہ غرض نہیں کہ مخاطب کون ہے۔

جس طرح کسی غریب آدمی کو اتفاقاً کوئی دولت ہاتھ آجاتی ہے اور وہ موقع بے موقع دولتمندی جتاتا پھرتا ہے اُسی طرح عشق کے نشہ میں عاشق یہ سمجھتا ہے کہ تمام دنیا کی دولت اُس کے ہاتھ آگئی ہے اس لئے وہ کسی نہ کسی کو اپنا مخاطب بنا کر بے اختیار عشق کا دعویٰ کرتا ہے اور فخر و غرور کے لہجہ میں اُسکی شدت کا اظہار کرتا ہے۔

حضرت مجنوں کی بھی اب یہی حالت ہے، ہر آنے جانے والے سے پوچھتا پھرتا ہے کیا تمھیں میری پیاری لیلیٰ کی کچھ خبر ہے، موسم حج میں سامنے سے قافلے گزر رہے تھے اُسے بیٹھے بیٹھے یہ شبہ ہوا کہ کسی ہودج میں کہیں میری پیاری لیلیٰ نہ چھپی بیٹھی ہو، بے اختیار پکار اُٹھا،

۱- اَحُجاج بیت اللہ فی ارض غربۃ
فی اَیِّ حذرٍ من حذورکم "قلبی"

اے خانۂ کعبہ کے جانے والو، سچ بتاؤ "میری دل و جان" تمھارے ان محملوں میں سے کس محمل میں ہے؟

۲- اَاَبقی اسیر الحبّ فی ارض غربۃٍ
وحادِیکم یحدو بقلبی فی الرکب

کیا میں ایک اجنبی ملک میں اسی طرح گرفتار محبت پڑا رہوں گا اور تم قافلے کے ساتھ "میرے دل" کو بھی لئے چلے جاؤ گے؟

مگر جب کچھ جواب نہیں ملتا تو کبھی باد صبا کو قاصد بنا کر محبوبہ کے پاس سلام و پیام کہلا بھیجتا ہے اور کہتا ہے،

فقلتُ نسیم الریح اذ تحیتی،
الیہا و ما قد حلّ بی وَدَّھا بیا

میں نے باد صبا سے کہا کہ میرا سلام محبوبہ کو پہونچا دے اور اُسکی محبت نے جو مصیبت مجھ پر ڈھا رکھی ہے وہ بھی اُس سے کہدے

اور کبھی کوّے سے اپنے ہجر و فراق کی داستان غم محبوبہ تک پہونچانے کی التجا کرتا ہے اور کہتا ہے:-

۱- الا یا غرابُ البین ان کنتَ ھابطًا
بلاداً لیلی فاتنمس اَن تکلما

ہاں! اے کوّے اگر لیلیٰ کے ملک میں تیرا گزر ہو تو میں درخواست کرتا ہوں کہ تو اس تک

۲- وبلّغ تحیاتی الیہا وصبوتی
وکنْ بعدھا عن سائر الناس اعجما

میرا سلام اور سوزش عشق کا حال پہونچا دے، اور پھر ساری دنیا سے تو گونگا بن جا۔

مگر جب اس سے بھی مایوسی ہوتی ہے تو اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے

۱- فیا قلبُ مُت حزنًا ولا تک جازعًا
فان جزوع القوم لیس بخالدٍ

اے دل اب رنج و غم سے مرجا اور آہ و زاری مت کر، اس لئے کہ قوم میں آہ و زاری کرنے والے ہمیشہ نہیں رہتے۔

۲- ھویتُ فتاۃً کالغزالۃ وجہہا
وکالشمس یُسبی دلّہا کلّ عابدٍ

میں ایک ایسی دوشیزہ سے محبت کرتا ہوں، جسکا چہرہ غزال رعنا کی طرح مثل آفتاب کے ہے اور جس کا ناز و انداز ہر ایک عبادت گزار کو اپنے دام محبت میں پھنسا لیتا ہے۔

۳- ولی کبدٌ حرّاء قلبٌ معذّبٌ
ودمع حَشیتُ فی الھوی غیر جامد

میرے پاس سوزش عشق سے تپتا ہوا ایک جگر ہے اور ایک گرفتار بلا دل، اور محبت سے بہتے ہوئے آنسو جو خشک نہیں ہوتے۔

۴۔ فیا اسفًا حتّام قلبی معذبٌ
الی اللہِ اشکو طولَ ہذی الشدائد

افسوس! میرا دل کب تک اس عذاب میں مبتلا رہے گا،
میں خدا سے ان طویل مصائب کی فریاد کرتا ہوں۔

جب اس پر بھی چین نہیں ملتا تو دوستوں کو پکارتا ہے کہ خدا کے لئے آؤ میری تجہیز و تکفین کا سامان کرو اور میری طرف سے اُس ماہتاب حُسن کو سلام پہونچا دو۔ کہتا ہے:۔

۱۔ خلیلیَّ قد حانت وفاتی فاطلبا
لی النعش والاکفان واستغفرا لیا

میرے دونوں دوستو، میری موت قریب ہے میرے لئے
نعش اور کفن تیار کرو، اور میرے لئے دعائے مغفرت بھی کرو۔

۲۔ وان متُّ من وار الصبابۃ ابلغا
تحیۃ ضوء الشمس منی سلامیا

اگر میں سوزش عشق سے مرجاؤں تو میری جانب سے اُس
ماہتاب حُسن کو سلام پہونچا دو۔

نامہ و پیام

دنیائے حسن و عشق ایک ایسا اسٹیج ہے جس کے ایکٹر یا تو صبح وصال میں عیش و کامرانی کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ یا پھر شام فراق میں شمع مہجور کی طرح تن تنہا پڑے آنسو بہا رہے ہیں۔

لیلیٰ ایک پردہ دار باعفت لڑکی تھی، مجنوں کی طرح وہ اپنے جذبات علانیہ نہیں بیان کر سکتی تھی، حالانکہ محبت کی آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی تھی، اُس کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی آخر وفور جذبات سے مجبور ہو کر ایک روز اُس نے مجنوں کے نام ایک خط لکھا جس میں اُس کو بہت کچھ تسکین دینے کی کوشش کی تھی اور یہ لکھا تھا کہ وہ اپنے جنون اور وارفتگی سے باز آئے۔ خط کے آخر میں یہ شعر بھی تھے۔

۱۔ لقد عیل صبری بعدکم وتکاثرت
ھمومی ولکنَّ المحبَّ صَبورُ

تمہارے بعد صبر و قرار کا یارا نہیں رہا، اور رنج و غم بڑھ گئے۔
تاہم محبت کرنے والے کو صبر سے کام لینا چاہئے۔

۲۔ فصبرًا علی ریب الزمان وجورہ
لعل صروف الدائرات تدورُ

زمانہ کے مصائب اور اُس کے مظالم پر صبر کرو
شاید حوادث روزگار سے یہ مصیبتیں ختم ہو جائیں۔

مجنوں کو جب یہ نامۂ محبت ملا تو وہ خوشی سے اُچھل پڑا اُس نے جواب دیا کہ:۔

من قیس ابن الملوح الہائم الوامق
الی سیدۃ الملاح وکوکب الصباح لیلی العامریۃ

عاشق شیدائی قیس ابن ملوح کی طرف سے ملاحِ حسن "لیلیٰ عامریہ" کو معلوم ہو کہ

ورد الیَّ کتابک
ایَّتہا الجبیۃ، فقرأتہٗ
طرًا، وانا لم ازل فی ہذا القفار اہیم
مع الوحوش والغزلان وحیدًا ذلیلاً

پیاری! تمہارا محبت نامہ ملا،
میں نے اُسے بڑی مسرت سے پڑھا،
میں اسی جنگل میں پرندوں اور ہرنیوں کے ساتھ تنہا
ذلیل و خوار بھٹکا پھر رہا ہوں

اقامی القرّ و الاحزان حتی صرتُ نحیلاً کالخیال من شوقی ، وکادت ، تقضنی علی تباریح الہوی والسلام۔

گرمی و سردی، رنج و غم سہتے سہتے خیال کی طرح نحیف و لاغر ہوگیا ہوں اور قریب ہے کہ محبت کی تکالیف میرا خاتمہ کردیں،

والسلام!

لیلیٰ کے اعزہ کو اس نامہ و پیام کی اطلاع ہوگئی، انھوں نے لیلیٰ کو دھمکایا کہ اگر اب پھر تم نے یہ حرکت کی تو ہم تمھیں اور مجنوں دونوں کو قتل کرڈالیں گے، لیلیٰ نے اُسوقت جو کچھ جواب دیا اس کی برجستگی ملاحظہ ہو:۔

۱۔ توعدنی قومی بقتلی وقتلہ فقلتُ اُقتلونی واترکوہ من الذنب

مری قوم میرے اور اُس کے قتل کی مجھے دھمکی دیتی ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے مار ڈالو مگر اُس کا قصور معاف کردو۔

۲۔ ولا تتبعوہ بعد قتلی ذلۃً کفیٰ بالذی یلقاہ من سوءۃ احبّ

اور میرے قتل کے بعد اُسے ذلیل و رسوا نہ کرو اُس کے لئے سوزش عشق ہی کیا کم ہے۔

حسرت و ناکامی

اس عرصہ میں مجنوں کے باپ نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ لیلیٰ سے کسی طرح اُس کی شادی ہوجائے مگر اس درخواست کو لیلیٰ کے باپ نے کسی طرح منظور نہ کیا، اس لئے کہ اہل عرب اس قسم کی شادیوں کو بہت معیوب سمجھتے تھے، قبیلہ میں اگر کسی کے عشق و محبت کا چرچہ پھیل جاتا تھا تو محبوبہ پر قید و بند اور زیادہ ہوجاتی تھی، قبیلہ کے جاں باز ہمہ وقت دیکھ بھال رکھتے تھے اور کسی عاشق ناکام کی محبوبہ تک رسائی ناممکن ہوجاتی تھی، کوئی اُدھر کا رُخ بھی کرتا تو ہزاروں کے سر کٹ جاتے اور خون کی ندیاں بہ جاتیں، متنبی کہتا ہے:۔

دیار اللواتی ارھنّ عزیزۃٌ بسمر القنا یحفظن لا بالتمائم

اُن دوشیزاؤں کے دیار جن کے گھر عزیز ہیں گندمی نیزوں سے حفاظت کئے جاتے ہیں تعویذوں سے نہیں۔

نوفل بن مساحق جو اُسوقت حکومت کی طرف سے بنی عامر پر حاکم بنا کر بھیجے گئے تھے، جب نجد کے سنگلاخ ٹیلوں پر سے گزرے تو انھوں نے مجنوں کو ریگستان میں سر پٹختے ہوئے دیکھا، لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ کون ہے؟ اور کیا چاہتا ہے؟ حالات معلوم ہونے پر وہ مجنوں کے قریب گئے، دیر تک اُس سے اشعار سنتے رہے، اُن کو مجنوں کی زبوں حالی پر ترس آگیا انھوں نے مجنوں سے کہا اچھا تم مرے ہمراہ چلو میں تمھاری شادی کرادوں گا،

لیکن جب اسکی اطلاع لیلیٰ کے خاندان والوں کو ہوئی تو وہ مسلح ہوکر میدان میں آگئے، پہلے تو نوفل نے سب کو دھمکایا اور اپنی طرف سے بھی لڑائی کی مستعدی ظاہر کی، مگر جب انھوں نے دیکھا کہ بنی عامر جان ہی دینے پر آمادہ ہیں تو انھوں نے مجنوں کو مخاطب کرکے کہا کہ "بھائی تمھارا ناکام جانا ہی صدہا آدمیوں کے مارے جانے سے بہتر ہے، لہذا

میں مجبور ہوں۔"

مجنوں کو اس واقعہ سے اور زیادہ صدمہ پہونچا، اُسوقت اُس نے جو اشعار کہے تھے وہ درج ذیل ہیں:۔

۱۔ اَیا ھجر لیلیٰ قد بلغتِ بی المدی
وزدتِ علی مالم یکن بلغ الھجر

ہائے فراق لیلی! تو نے انتہا کردی،
تو اُس مرتبہ سے کچھ آگے بڑھ گیا جہانتک غم جدائی ابتک نہیں پہونچا۔

۲۔ عجبتُ لسعی الدھر بینی وبینھا
فلما انقضیٰ ما بیننا سکن الدھر

میرے اور اُسکے درمیان جب تعلقات قایم تھے اُسوقت زمانہ
جس کوشش سے جلد جلد گزر رہا تھا مجھے اُس پر تعجب ہے
لیکن جب وہ تعلقات ختم ہوگئے تو زمانہ بھی جم کر رہگیا۔

۳۔ فیا جبھا زدنی جوی کل لیلۃ
ویا سلوۃ الایام موعدک الحشر

ہاں! اے محبت کچھ سوزش عشق اور زیادہ کر۔ اور اے زمانہ
کی راحت تیرا وعدہ تو حشر کے روز پورا ہوگا۔

اس واقعہ کے کچھ روز بعد لیلیٰ کے باپ نے موقع پاکر اپنے قبیلہ کے ایک نوجوان سعید بن حنیف سے لیلیٰ کا نکاح بھی کردیا، یہ خبر جب مجنوں کو پہونچی تو اُس کی مایوسیوں کی انتہا نہیں رہی اور وہ گھر بار، عزیز و قریب سب کو چھوڑ چھاڑ ہمیشہ کے لئے جنگل میں جا بسا، مگر اُسے وہاں ریگستان میں بھی چین نہ تھا، شب و روز "لیلیٰ" ہی "لیلیٰ" پکارتا پھرتا تھا۔ اُس نے اس موقعہ پر جو شعر کہے تھے وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ وقد خبروني انّ لیلیٰ تزوجت
ولابد لی من ان الاقی حلیلھا

مجھے لوگوں نے خبر دی ہے کہ لیلی کی شادی ہوگئی
میں اُس کے شوہر سے ضرور ملوں گا،

۲۔ فان مثلی لا المھا علی الھویٰ
وان کان دونی بیس ما قد قضیٰ لھا

مجھ جیسا شخص محبت کی وجہ سے اُس کو تکلیف نہیں دینا چاہتا۔
اگر مرے علاوہ کوئی دوسرا ہوتا تو اُس کے لئے برا فیصلہ کرتا۔

والہانہ وارفتگی ادہر شادی کے بعد سے لیلیٰ کی روز بروز حالت خراب ہوتی گئی، اُس کے شوہر کو جب زیادہ فکر ہوئی تو ایک مرتبہ وہ خود مجنوں کے پاس گیا اور اُس سے کہا:۔

۱۔ ومن عجب جنونک فی فتاۃ
مزوجۃ سواک ولن تراھا

تیرا جنون اُس دوشیزہ کے بارے میں عجیب ہے جسکی تیرے علاوہ
ایک دوسرے شخص سے شادی ہوچکی ہے، درانحالیکہ تو نے اُسکو دیکھا نہیں

۲۔ اَیا مجنوں کم تھویٰ بلیلی،
کانّ اللہ لم یخلق سواھا،

اے مجنوں! تو لیلی سے کیسے محبت کرتا ہے گویا خدا نے
اُس کے علاوہ کوئی دوشیزہ پیدا ہی نہیں کی ہے،

مجنوں نے انداز نصیحت سے سمجھ لیا کہ ہو نہ ہو یہی خوش نصیب لیلی کا شوہر ہے اُس نے قسم دیکر اُس سے دریافت کیا۔

۱۔ بعیشک ھل ضممت الیک لیلیٰ ،
قبیل الصبح اَم قبّلت فاھا
۲۔ وھل دارت یداکَ بمنکبیھا
وھل مالت علیک ذُوابتاھا

تجھے اپنی زندگی کی قسم، کیا تو نے کبھی لیلیٰ کو صبح سے پہلے اپنے سینہ سے لگایا ہے؟ یا کبھی اُس کے دہن کے بوسہ لئے ہیں۔ اور کیا تیرے دونوں ہاتھ کبھی اُس سے بغلگیر ہوئے ہیں اور کیا اُس کی زلفیں کبھی تیرے سینہ پر لہرائی ہیں۔

یہ سن کر لیلیٰ کا شوہر مارے شرم کے پسینہ پسینہ ہو گیا اور اُس کے حال پر تاسف کرتا ہوا اپنے گھر لوٹ آیا۔

وحشت وجنوں

عشق کا آغاز فریفتگی سے ہوتا ہے اور انجام دیوانگی پر، یہ نشہ جوں جوں تیز ہوتا جاتا ہے، انسان دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتا جاتا ہے، وہ حصول محبوب کے لئے ہر طرح کے خطرات کا مقابلہ کرتا ہے اور اپنی جان تک سے دریغ نہیں کرتا۔ وہ اُس کے لئے سمندر میں پھاند پڑتا ہے، آگ میں کود جاتا ہے، تیغ زنی اور نبرد آزمائی کے بڑے بڑے معرکوں میں شریک ہوتا ہے اپنے کو خطرات میں ڈالتا ہے اور جاہ و ثروت حاصل کرتا ہے۔

یہ سب کچھ کیوں؟ صرف اس لئے کہ وہ محبوب کی نظروں میں عزت حاصل کرنا چاہتا ہے اور اُس کو ہمیشہ کے لئے اپنا بنانا چاہتا ہے، مگر اس مقصد میں جب کسی طرح کامیابی نہیں ہوتی تو اُس کو تمام دنیا تیرہ و تار نظر آنے لگتی ہے، دل قابو میں نہیں رہتا، ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے لوگوں سے نفرت ہو جاتی ہے، اور رات دن اپنے دشت غم میں بھٹکتا پھرتا ہے، ایسی حالت میں اگر کوئی چیز مونس و غمخوار ہوتی ہے تو صرف خیال یار۔

لیلیٰ کی شادی ہو جانے کے بعد مجنوں کو جو مایوسی ہوئی وہ اُس کے لئے ناقابل برداشت تھی، اب اُسکو ریگستان میں بھی چین نہیں تھا، اُس کے رہے سہے حواس جاتے رہے، کبھی وہ ہوا سے باتیں کرتا تھا اور کبھی جانوروں سے سرگوشیاں کرتا تھا، اُسے زندگی دوبھر تھی، کبھی پہاڑ سے پھاندنے کی کوشش کرتا تھا، کبھی دریا میں ڈوب کر جان دینا چاہتا تھا۔

ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے دیکھا کہ بنو عمیون کی پہاڑی پر سے ایک شخص اپنے کو نیچے گرا رہا ہے، لوگوں نے دوڑ کر اُسے بچایا، دیکھا تو مجنوں تھا، اُسوقت مجنوں نے ایسے رقت آمیز لہجہ میں مندرجۂ ذیل شعر پڑھے کہ لوگوں کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے:۔

۱۔ لقد ھممتُ قیسٌ اَن یزجّ بنفسہ
ویرمی بھا من ذروۃ الجبل الصعب
۲۔ فلا عزّوان الحب للمرء قاتل
یقلبہ ما شاء جنبًا الی جنبِ

قیس نے ارادہ کیا کہ وہ اپنی اندوہناک جان سے رہائی پا جائے اور اُس کو ایک سخت پہاڑ کی چوٹی پر سے گرا دیوے،
ہاں! بیشک محبت انسان کو قتل کرنے والی ہے، وہ اُس کو جس طرح چاہتی ہے ایک پہلو سے دوسرے پہلو کی طرف تڑپاتی رہتی ہے

۳- اَنَاخَ ھوای لیلیٰ بہ فاذابہ
ومن ذالیطیق الصبر عن محمل الحُبّ

لیلیٰ کی محبت نے قیس کے پاس قیام کرلیا ہے، اور کون ہے جو محبت کے مقابلہ میں صبر کی طاقت رکھتا ہو۔

۴- فیسقیہ کاس الموت قبل اَوانہ
ویُوردہ قبل الممات الی الترب

محبت عاشق ناکام کو وقت سے پہلے ہی موت کا پیالہ پلا دیتی ہے اور موت سے پہلے ہی اُس کو خاک میں ملا دیتی ہے۔

اس کے بعد روز بروز اُس کی حالت بدسے بدتر ہوتی گئی، مدتیں گزر گئیں نہ دانہ تھا نہ پانی، جسم سوکھ کر کانٹا ہوگیا، بال تمام جسم کے بڑھ گئے، حتی کہ دور سے دیکھ کر آدمی کو ڈر معلوم ہوتا تھا۔

قبیلۂ بنی اسد کے ایک شخص کا بیان ہے کہ "ایک مرتبہ میں نجد کے ریگستان سے گزر رہا تھا۔ یکایک ایک نحیف الجثہ شخص مجھے نظر آیا جس کے سر کے بڑے بڑے بال سینہ پر پھیلے ہوئے تھے، میں اُسے دیکھکر ڈرا میں نے اُس سے دریافت کرتے ہوئے کہا کہ تم آدمی ہو یا جن؟ وہ آبدیدہ ہوگیا اور بولا:۔

۱- الیک عنی فانی ھائمٌ وصِبٌ
اماتری الجسم قد اودی بہ العطب

مجھ سے دور رہو، میں ایک عاشقِ دلگیر ہوں، تم دیکھتے نہیں ہو، کہ مصیبتوں نے میرے جسم کو تباہ کر دیا ہے۔

۲- ضاقت علیّ بلاد اللہ ما رحبت
یا للرجال فھل فی الارض مضطرب

خدا کا ملک باوجود کشادہ ہونے کے مجھ پر تنگ ہوگیا ہے، لوگو! سچ بتاؤ کیا دنیا میں کوئی اور بھی مجھ سا بے چین دل ہے؟

۳- البین یؤلمنی والشوق یجرحنی
والدار نازحۃٌ والشمل منشعب

جدائی مجھے دُکھ پہونچا رہی ہے اور شوق وصال مجھے زخمی کئے دیتا ہے، گھر بار مٹ گیا اور خانمان منتشر ہوگیا۔

۴- کیف السبیل الی لیلیٰ وقد حجبت
عھدی بھا زمنا ما دونھا حجب

آہ، میں لیلیٰ تک کیونکر پہونچ سکتا ہوں جبکہ وہ ایک زمانہ سے پردہ میں ہے۔

مجنوں اپنے انھیں جنون انگیز ولولوں میں کوہ وصحرا کی خاک اُڑاتا پھرتا تھا، کہ لیلیٰ اُس کے غم میں کڑھتے کڑھتے مرگئی، کچھ روز بعد جب مجنوں کو خبر ملی تو وہ بنی عامر کے قبرستان میں پہونچا اور لوگوں سے پوچھنے لگا کہ لیلیٰ کی قبر کہاں ہے؟ لوگوں نے اس خیال سے کہ اس کی بھی مفت میں جان جائے گی قبر کا پتہ نہیں بتایا، مجنوں نے قبروں کی مٹی اُٹھا اُٹھا کر سونگھنا شروع کی، جب لیلیٰ کے قبر کی مٹی اُس کے ہاتھ میں آئی تو اُسوقت اُس نے یہ شعر پڑھا:۔

یریدون یخفوا قبرھا عن حبیبھا
وطیب تراب القبر دلّ علی القبر

لوگ چاہتے کہ محبوبہ کی قبر کو اُسکے شیدائی سے چھپا دیویں درانحالیکہ خاک قبر کی خوشبو خود قبر کا پتہ دے رہی ہے۔

پھر کچھ عرصہ تک وہ بالکل ہی غائب رہا، جب لوگوں نے تلاش کیا تو اُسے ایک قبرستان میں مرا ہوا پایا، اُسکے

سرہانے یہ شعر لکھے ہوئے تھے :-

۱- تؤسدا حجازا لیمامۃ والقفر
وماتَ جریح القلب مندمل الصدر

یمامہ اور جنگل کے پتھروں کا تکیہ بنا کر ایک زخمی دل عاشق ناکام تھا جو مر گیا۔

۲- فیالیت ھذا الحبُّ یعشق مرۃً
فیعلم ما یلقی المحبُّ من الصخر

کاش! یہ نامراد محبت کبھی کسی پر عاشق ہوتی اور اسے معلوم ہوتا کہ ایک عاشق دلگیر کو کیا کیا سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں۔

مجنوں کے اعزہ کو جب خبر ہوئی تو وہ روتے پیٹتے آئے، اُس کی لاش کو غسل دیا اور تجہیز و تکفین کے بعد اُسے دفن کیا، اُس کی قبر پر ایک عام ماتم تھا جس میں عورت اور مرد دونوں شریک تھے، یہ ۸۰ھ کا واقعہ ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لیلیٰ و مجنوں محض ایک فرضی افسانہ ہے، لیکن میں حیران ہوں کہ تاریخ کا اتنا مشہور واقعہ بالکل بے بنیاد کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے[1]۔ پھر جبکہ اُس کا دیوان ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے تو ہم یہ کیونکر مان لیں کہ یہ محض افسانہ ہی افسانہ ہے، من گڑھت افسانے ضرور تیار کئے جا سکتے ہیں لیکن یہ ذرا مشکل ہے کہ کوئی صاحب ایک دیوان بھی کسی سر پھرے کے نام سے منسوب کر دیں۔

جہاں تک افسانۂ محبت ہونے کا تعلق ہے اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو خلاف عقل ہو، حسن و عشق کی بوالعجبیاں اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر دنیا میں رونما ہوئی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔

یہ یقینی بات ہے کہ "لیلیٰ و مجنوں" کسی زمانہ میں دنیا کی جیتی جاگتی تصویریں تھیں جواب دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں ان دونوں کا افسانہ، محبت کا وہ پاک صحیفہ ہے جو تا قیامت مٹ نہیں سکتا۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

جلیل اعظمی

---

[1] بالکل اسی طرح جیسے خرافیات کے بہت سے افسانے اب بھی مذہبی حقیقت سمجھے جاتے ہیں۔ نیاز

ضرورت ہے

فروشی شکایۃ کے پرچہ کی اگر کوئی صاحب علیحدہ کرنا چاہیں تو دفتر سے خط و کتابت کریں۔ ..... منیجر نگار

مفکرینِ عظام

سقراط

(۱)

(اڈیٹر نگار کی دو تقریریں جو ۴ اور ۱۸ اکتوبر کو دہلی کے لاسلکی اسٹیشن سے نشر کی گئیں)

سقراط کی پیدائش سے قبل یونانیوں یا اہل ایتھنس کی عام زندگی دو چیزوں سے متاثر تھی، ایک ان کا غیر معتدل نظام دیمقراطی یعنی ان کی وہ ڈیماکریٹک حکومت جس نے انفرادی آزادی کو حکومت کا مدِّ مقابل بنا رکھا تھا اور دوسری چیز جس نے عام ذہنی اضطراب پیدا کر رکھا تھا۔ وہ مختلف جماعتوں کے مختلف فلسفیانہ نظریے تھے۔ ان دو باتوں نے ان کے ذہن و خیال میں بے اعتباری پیدا کر کے اُنھیں عجیب و غریب قسم کے وہم و شک میں مبتلا کر رکھا تھا اور یقین کی کیفیت انکے قلب و دماغ سے محو ہو گئی تھی۔ اُن کو اپنے فلسفے کی طرف سے شک پیدا ہو گیا تھا کیونکہ وہ کائنات کا راز حل کرنے سے قاصر نظر آتا تھا۔ اُنھیں اپنے مذہب میں شک تھا کیونکہ اُس کی ہر تلقین دائرۂ عقل سے باہر معلوم ہوتی تھی، ان کو اپنی سیاسی زندگی میں شک تھا کیونکہ وہ آپس کی پھوٹ کو دور نہ کر سکتی تھی۔ الغرض ان کی زندگی سراپا وہم و شک تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخرکار سوفسطائیوں ( ) کی جماعت رونما ہوئی جس کا فلسفہ سوائے انفرادی خود غرضی اور خود پرستی کے کچھ نہ تھا۔ کچھ زمانہ کے بعد جب سوفسطائی بداخلاقیاں اور خود غرضیاں انتہا کو پہونچ گئیں تو قدرت نے اس ذہنی اضطراب اور اخلاقی گندگیوں کو دور کرنے کے لئے سقراط کو پیدا کیا۔

یہ ۴۷۰ سال قبل مسیح پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ معمولی سنگتراش تھا اور ماں دائی کا پیشہ کرتی تھی۔ سقراط کی ابتدائی زندگی کا حال بہت کم معلوم ہے سوائے اس کے کہ اول اول تو اس نے اپنا آبائی پیشہ اختیار کیا۔ لیکن کچھ دنوں بعد ہی اسے ترک کر کے فلسفہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سوائے دو تین بار کے جبکہ وہ یونانی فوج کے ساتھ شریک ہو کر لڑائی کے لئے باہر گیا، اس نے اپنی ساری عمر ایتھنس میں صرف کی۔ صورت و شکل کے لحاظ سے وہ بہت بدنصیب تھا اور جوں جوں اُس کی عمر زیادہ ہوتی جاتی تھی اُس کی بدصورتی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ وہ ہمیشہ پھٹے پرانے کپڑے پہنتا تھا اور ظاہری نمود و نمایش

کی طرف سے بالکل بے پرواہ تھا۔

اس کو یقین تھا کہ کوئی آسمانی قوت اُس کے افعال و اقوال کی نگراں ہے اور اُس کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے وہ الہام ہوتا ہے۔ اُس نے کبھی اپنے خیالات کو قلمبند نہیں کیا۔ اُس کا طریق تعلیم یہ تھا کہ بازاروں میں، قہوہ خانوں میں، تفریح گاہوں میں، جہاں مجمع ہوتا چلا جاتا اور گفتگو شروع کر دیتا، وہ سوفسطائیوں کی طرح بڑی بڑی تقریریں نہیں کرتا تھا وہ مختصر سوال و جواب کی صورت میں مباحثہ شروع کرتا اور فریق ثانی کے کمزور پہلوؤں کو نمایاں کر کے خاموش ہو جاتا۔

جب بحث شروع ہوتی تو سقراط اپنے آپ کو ایک ناواقف متعلم کی حیثیت سے پیش کر کے فریق ثانی سے کہتا کہ میں بالکل جاہل ہوں آپ مجھے کچھ بتائیے، سمجھائیے اور جب وہ کچھ کہتے تو یہ ان پر اعتراض شروع کر دیتا۔ اور چونکہ قدرت نے اُس کو بہت فصیح و بلیغ پیدا کیا تھا اس لئے تمام مجمع اس کی خوش بیانی و حسن استدلال سے مرعوب ہو جاتا اور فریق ثانی اپنی کمزوریوں کو محسوس کرنے لگتا۔

اُس کی طلاقت لسانی ایک ایسا زبردست سحر تھا جس نے تمام نوجوانان ایتھنس کو اس کا دیوانہ بنا رکھا تھا۔ چنانچہ جن الزامات میں بعد کو اسے زہر دیا گیا اُن میں ایک یہ بھی تھا کہ وہ ایتھنس کے نوجوانوں کے اخلاق خراب کرتا ہے حالانکہ اس سے زیادہ شریف خصلت انسان سرزمین ایتھنس میں اُس وقت کوئی نہ تھا۔ وہ حد درجہ سادہ زندگی بسر کرتا تھا اور تن آسانیوں کو بدترین جرم سمجھتا تھا۔ اُس کی جسمانی صحت بھی بہت قابل رشک تھی اور وہ مصائب و تکالیف کو نہایت خوشدلی سے برداشت کیا کرتا تھا۔ گو اُس نے ہمیشہ احتیاج و افلاس کی زندگی بسر کی لیکن رہبانیت کو اُس نے کبھی پسند نہیں کیا، وہ اسی دنیا میں رہ کر اس کی تمام تکالیف برداشت کرتے ہوئے، خوش اخلاق رہنے کی تعلیم دیتا تھا۔ اور ترک دنیا کو بہت بُرا سمجھتا تھا۔ وہ شراب کا عادی نہ تھا لیکن جب کبھی پینے پر آجاتا تھا تو بڑے بڑے میخواروں کو نیچا دکھا دیتا تھا۔ "Banquet of Plato" ضیافت افلاطون میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ سقراط ساری رات شراب پیتا رہا اور احباب سے فلسفیانہ گفتگو میں مصروف رہا۔ رفتہ رفتہ صبح تک سب مدہوش ہو گئے لیکن سقراط کے حواس بدستور قایم رہے۔ اُس کے آخری عمر کا سب سے اہم واقعہ جس نے اس کو زندہ جاوید بنا دیا اُس کے زہر پینے کا واقعہ ہے جس کو میں ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔

سقراط کی عمر ۷۰ سال کی تھی جب اُس پر عدالت گاہ سے تین الزام قائم کئے گئے ایک یہ کہ وہ قومی دیوتاؤں کا انکار کرتا ہے دوسرے یہ کہ وہ پرانے دیوتاؤں کی جگہ اپنے نئے دیوتا قایم کرنا چاہتا ہے اور تیسرا یہ کہ وہ نوجوانوں کے اخلاق خراب کرتا ہے۔ حالانکہ ان میں سے کوئی الزام بھی صحیح نہیں تھا۔ قومی دیوتاؤں کا انکار سقراط کیا یونان قدیم کے تقریباً ہر مفکر نے کیا تھا۔ بلکہ سقراط تو اس معاملہ میں اتنا سخت بھی نہیں تھا اور ان دیوتاؤں کی عزت کرنے کی تلقین کیا کرتا تھا اس لئے پہلا الزام قطعاً بے بنیاد تھا۔ دوسرے الزام قایم کرنے کا سبب یہ ہوا کہ وہ اپنی تقریروں

کو الہامی بتاتا تھا اور اس سے لوگ اس بدگمانی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ یہ نئے دیوتا پیدا کرنا چاہتا ہے۔ تیسرا الزام نوجوانوں کے اخلاق خراب کرنے کا بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اُس کا ایک نہایت عزیز شاگرد السبیاڈس جو سقراط سے منحرف ہو گیا تھا ضرور بدچلن ثابت ہوا۔ لیکن سقراط یا سقراط کی تعلیم کو اس سے کوئی واسطہ نہ تھا اس لئے غور طلب امر یہ ہے کہ اس پر یہ الزامات کیوں قایم کئے گئے۔ اس کا ایک بڑا سبب تو یہ تھا کہ اُس نے اپنے بہت سے ذاتی دشمن پیدا کر لئے تھے۔ ایتھنس کا کوئی صاحب اقتدار شخص ایسا نہ تھا۔ جو اس کے حملوں سے محفوظ رہا ہو۔ ہر چند وہ تین شخص جنھوں نے سقراط کے خلاف دعویٰ دائر کیا تھا اس سے کوئی دشمنی نہ رکھتے تھے۔ لیکن اُن کے اُبھارنے والے ایتھنس کے وہی بڑے بڑے لوگ تھے جو سقراط کے شدید دشمن تھے۔ اُسوقت ایتھنس میں ڈیماکریٹک حکومت قایم تھی۔ لیکن اس میں انتہائی بدنظمی پائی جاتی تھی۔ سقراط ہر چند شخصی حکومت کا قایل نہیں تھا تاہم وہ یہ ضرور چاہتا تھا کہ حکومت عقلمند اور دیانتدار لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔ جن کا اس وقت یہاں کی حکومت میں فقدان تھا۔ اور جن پر سقراط سخت تنقید کیا کرتا تھا۔ یہ تھا ایک بڑا سبب جس نے امرار ایتھنس کو اس کا مخالف کر دیا تھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ لوگ اُس کو سوفسطائی مسلک کا پیرو جانتے تھے۔ حالانکہ سقراط کو اس مسلک سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ سچ پوچھئے تو وہ اس کا شدید مخالف تھا۔

جس وقت یہ الزامات سقراط پر لگائے گئے اور وہ عدالت گاہ میں لایا گیا۔ تو اس کے تمام شاگردوں میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ لیکن اُس کے سکون و اطمینان قلب کا وہی عالم تھا۔

اس زمانہ میں عام قاعدہ یہ تھا کہ وہ لوگ جن پر کوئی الزام قایم کیا جاتا تھا۔ عدالت گاہ میں ججوں کی خوشامد کرتے روتے، پیٹتے اور اپنی بیوی بچوں کا واسطہ دلا کر رحم کی التجا کرتے۔ لیکن سقراط نہایت خاموشی کے ساتھ عدالت کی تمام کارروائیوں کو دیکھتا اور سنتا رہا۔ اُس کی اس خودداری نے ججوں کو اور زیادہ برہم کر دیا۔ آخر کار کثرت رائے سے وہ خطادار قرار دیا گیا۔ اُس وقت یہ دستور تھا کہ جب کسی شخص پر کوئی الزام ثابت ہو جاتا تو مدعیوں سے کہا جاتا کہ وہ کوئی سزا تجویز کریں اور اسی کے ساتھ ملزم سے بھی پوچھا جاتا کہ وہ اپنے لئے کون سی تعزیر مناسب سمجھتا ہے۔ اور ان دونوں میں جو سزا موزوں معلوم ہوتی وہ ججوں کی طرف سے تجویز کر دیجاتی۔ چنانچہ حسب قاعدہ سقراط کے مدعیوں سے پوچھا گیا کہ وہ کیا سزا تجویز کرتے ہیں اور اُنھوں نے بلا تامل سزائے موت تجویز کر دی۔ اس کے بعد سقراط سے پوچھا گیا کہ وہ کیا کہتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اگر سقراط خود اپنے لئے کوئی ہلکی سزا تجویز کر دیتا۔ تو غالباً وہ بچ جاتا لیکن اس نے حد درجہ خودداری کے ساتھ کہا کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے اور میں کسی سزا کا مستحق نہیں ہوں۔ سقراط کی اس خودداری نے ججوں کو اور زیادہ برہم کر دیا اور آخر کار اُس کے خلاف سزائے موت کا حکم جاری کر دیا گیا۔

اِس کے بعد پورا ایک مہینہ سقراط کا قید خانہ میں بسر ہوا اور اس دوران میں اُس کے دوستوں نے بہت کوشش کی کہ وہ بھاگ کر نکل جائے لیکن سقراط نے ہمیشہ انکار کیا اور کہا کہ موت سے بھاگنا بزدلی ہے اور قانون کی عزت ہر شخص کا فرض ہے اگر عدالت گاہ مجھ کو موت کا مستحق قرار دے چکی ہے تو مجھے ایک پُرامن شہری ہونے کی حیثیت سے اس حکم کا احترام کرنا چاہیئے اور خوشی سے اس سزا کو برداشت کرنا چاہیئے۔"

اُس وقت ایتھنس کے قید خانوں کی یہ حالت تھی کہ جیل والوں کو تھوڑی سی رشوت دینے کے بعد قیدی آسانی سے بھاگ سکتے تھے اور اگر سقراط چاہتا تو بغیر کسی دقت کے بھاگ کر نکل جا سکتا تھا لیکن اُس نے حکومت کی ناانصافی اور اِس ظلم کو بھی حد درجہ فلسفیانہ انداز سے برداشت کیا۔

افلاطون نے سقراط کی موت کی تفصیل جن الفاظ میں کھینچی ہے اُن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں بھی اپنے اُصول پر حد درجہ ثابت قدم رہا۔

جب قصاص کا مقررہ دن آیا تو سقراط حمام میں نہانے کے لئے گیا کریٹو اس کا شاگرد بھی اُس کے ساتھ تھا لیکن سقراط نے اُسے روک دیا۔ جب وہ نہا کر باہر نکلا تو اُس کے تین بچے اور خاندان کی عورتیں اُس کے سامنے لائی گئیں۔ سقراط نے اُن سے بہت مختصر باتیں کر کے اُن سب کو رخصت کر دیا اس کے بعد عدالت گاہ کا افسر اُس کے پاس آیا اور سقراط سے مخاطب ہو کر بولا "اس وقت تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے کسی مجرم کو زہر کا پیالہ پینے کا حکم دیا ہو اور مجھے اُس کے طرز عمل پر نکتہ چینی کا موقعہ نہ ملا ہو، لیکن اے سقراط! حقیقت یہ ہے کہ میں نے تجھ جیسا صابر، ضابط اور شریف خصلت انسان آج تک کوئی نہیں دیکھا۔ حد درجہ افسوس ہے کہ مجھے ایسے بلند اخلاق والے انسان کی جان لینا پڑتی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم مجھے معاف کر دو گے" اس کے جانے کے بعد سقراط نے کریٹو سے مخاطب ہو کر کہا کہ "یہ کیسا شریف انسان ہے اور میرے ساتھ کتنی ہمدردی رکھتا ہے۔ مناسب نہیں کہ اس کے حکم کی تعمیل میں دیر کی جائے۔ اگر زہر کا پیالہ تیار ہے تو لاؤ۔ ورنہ کہو کہ جلد تیار کر دیا جائے۔" کریٹو نے کہا کہ "اے سقراط۔ ابھی تو شام ہونے میں دیر ہے۔ سورج پہاڑوں پر چمک رہا ہے، اتنی جلدی کیا ہے۔ میں نے تو مجرموں کو بالکل آخر وقت زہر پیتے دیکھا ہے اور جو وقت اُنھیں ملا ہے انھوں نے کسی نہ کسی محبوب مشغلہ میں بسر کر دیا ہے۔ اس لئے تم کیوں اتنی جلدی کرتے ہو۔" سقراط نے جواب دیا "اُن لوگوں نے دیر کرنے میں کوئی فایدہ سوچا ہو گا۔ میرے سامنے تو کوئی چیز ایسی نہیں ہے۔ تم تو زہر لاؤ میں تیار ہوں۔ کریٹو نے یہ سنکر ایک لڑکے کی طرف اشارہ کیا جو قریب ہی کھڑا تھا لڑکا باہر چلا گیا اور اپنے ساتھ اُس شخص کو لے آیا جو زہر پلانے کی خدمت پر مامور تھا سقراط نے زہر کا پیالہ اُس کے ہاتھ میں دیکر پوچھا۔ اے میرے عزیز دوست تم کو ان باتوں کا بہت تجربہ حاصل ہے۔ بتاؤ زہر پینے کے بعد میں کیا کروں۔ اُس نے کہا کچھ نہیں۔ زہر پینے کے بعد ٹہلتے رہو یہاں تک کہ ٹانگوں میں بھاری پن محسوس ہو اُسکے

بعد لیٹ جانا اور یہ لیٹنا وہ ہوگا کہ اُس کے بعد پھر کبھی نہ اُٹھ سکو گے۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے زہر کا پیالہ سقراط کی طرف بڑھایا اور سقراط نے اُس کو لیکر نہایت اطمینان کے ساتھ پی لیا۔ یہ منظر دیکھ کر اُس کے احباب واعزہ رونے لگے۔ سقراط نے اُن سے کہا "اے میرے دوستو تم یہ کیا کر رہے ہو، مرنے والے کو ایسی بدشگونی کے ساتھ رخصت نہیں کرتے۔ یہ کہکر وہ ٹہلنے لگا تھوڑی دیر کے بعد جب ٹانگوں میں بھاری پن محسوس ہوا تو وہ چت لیٹ گیا اور زہر پلانے والے نے آکر اُس کی ٹانگیں مس کیں اور پوچھا کیا تم میرے چھونے کو محسوس کرتے ہو اُس نے کہا نہیں اس کے بعد اُس نے رانیں چھوئیں لیکن اب یہ بھی ٹھنڈی اور بے حس ہو چکی تھیں سقراط نے خود اپنے ہاتھ سے اپنے جسم کو چھوا اور کہا کہ زہر کے قلب تک پہونچنے میں اب زیادہ دیر معلوم نہیں ہوتی۔ اور کریٹو سے مخاطب ہو کر ہدایت کی کہ دیکھو میرے اوپر فلاں شخص کا کچھ قرض ہے وہ ضرور ادا کر دینا۔ اُس کے بعد وہ بالکل خاموش ہو گیا اور تشنج کی سی کیفیت اس کے اعضاء میں شروع ہوئی۔ لوگوں نے اُس کے جسم پر چادر ڈالدی اور اس طرح وہ ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے روپوش ہو گیا۔

(۲)

سقراط کی تعلیمات کا حال معلوم کرنے کے لئے دو ذریعہ ہمارے پاس ہیں۔ ایک افلاطون اور دوسرا زینفون۔ ہر چند افلاطون نے اپنے مکالموں میں سقراط کو جس صورت میں پیش کیا ہے وہ بہت زیادہ خود افلاطون ہی کی تعلیمات کا عکس ہے۔ تاہم غائر مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ افلاطون کے ابتدائی مکالموں میں حزور تعلیمات سقراط کی جھلک پائی جاتی ہے۔ زینفون چونکہ خود فلسفیانہ دماغ نہ رکھتا تھا بلکہ ایک معمولی سپاہی تھا اس لئے اُس نے سقراط کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس میں قطعاً کوئی فلسفیانہ روح نہیں پائی جاتی اور اس طرح ان دونوں کے بیانات سے جو نتیجے پیدا ہوتے ہیں ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے یعنی وہی تعلیمات جو افلاطون کے نزدیک بہت بلند ہیں زینفون کی رائے میں بہت پست ہیں۔ تاہم زینفون کی تحریروں سے سقراط کی زندگی اور اُس کی تعلیمات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔

سقراط کی تعلیمات یکسر اخلاق پر مبنی ہیں۔ اور صرف یہی ایک پہلو ایسا ہے جس میں وہ سوفسطائیوں سے کچھ مماثلت رکھتا ہے۔ کیونکہ یونانی فلسفہ میں سب سے پہلے سوفسطائیوں ہی نے انسان اور انسانی فرایض کے عنصر کو پیش کیا جس کا تتبع سقراط نے بھی کیا، اس کے علاوہ اور تمام مسائل مثلاً دنیا کی اصلیت حقیقیات کی نوعیت وغیرہ اُس نے نظر انداز کر دی ہے۔ سقراط کا خیال تھا کہ "ان تمام باتوں پر غور کرنا عبث ہے، اصل چیز دیکھنے کی صرف اخلاق اور علم الاخلاق ہے" ریاضیات، طبیعیات اور فلکیات کا علم باوجودیکہ وہ ان سے بلند نہ تھا انسان کے لئے غیر ضروری خیال کرتا تھا۔ ڈلفی کے معبد میں ایک عبارت منقوش تھی جس کا مفہوم یہ تھا کہ:۔

"اپنے آپ کو خود اپنے ہی سے پہچانو"

کہا جاتا ہے کہ سقراط کی تمام تعلیمات کی بنیاد اسی مقولہ پر قایم تھی اور حکمائے یونان میں غالباً یہ فخر سب سے پہلے سقراط ہی کو حاصل ہوا کہ اُس نے اخلاق کی بنیاد علم پر قایم کی۔

سقراط کی تمام اصلاحی تعلیمات اُس صداقت پر مبنی تھیں جس کو وہ نفس علم سے تعبیر کرتا تھا۔ وہ نیکی اور علم میں کوئی فرق نہ کرتا تھا وہ کہا کرتا تھا کہ اگر نیکی علم ہے تو گناہ یقیناً جہل ہے۔ سقراط علم و عقل میں بھی کوئی فرق نہ سمجھتا تھا۔ اس کی رائے میں دونوں ایک چیز تھیں۔ اسی لئے اُس نے سب سے پہلے یہ کوشش کی کہ لوگوں کے طبایع میں اُن کے جہل کا احساس پیدا ہو جائے اور وہ علم حقیقی کی ضرورت و اہمیت کو محسوس کرنے لگیں۔ وہ انفرادی یا شخصی حیثیت سے کسی چیز کو نہیں دیکھتا تھا وہ ہر شے پر "کل" کی حیثیت سے نگاہ ڈالتا تھا۔ اُس کے سامنے زید، عمرو و بکر کا سوال کبھی نہیں آیا۔ بلکہ کلی حیثیت سے انسان کے مفہوم اور اخلاق کی غایت پر غور کرتا تھا۔ اُس کے یہاں کسی چیز کے جانچنے کا معیار صرف عقل تھا اور ہمیشہ استقرا یعنی (Induction) کے بعد نتیجہ پر پہونچتا تھا۔ مثلاً وہ انسانوں کے ان افعال کو لے لیتا جن کو عام طور پر عاقلانہ کہا جاتا ہے اور غور کرتا کہ ان میں کون سی صفت مشترک پائی جاتی ہے اور اس طرح وہ "عقل و بصیرت" کے مفہوم کو سمجھتا۔

سقراط نے جو نظریۂ علم پیش کیا وہ صرف نظریہ کی حیثیت نہ رکھتا تھا بلکہ اُس کا مقصود صرف عمل تھا یعنی اگر وہ نیکی کا کوئی مفہوم مقرر کرتا تھا تو اُس پر عمل بھی کرتا تھا اور دوسروں سے بھی عمل ہی کی تمنا کرتا تھا۔ اور تعلیمات سقراط کا یہی مرکزی نقطہ تھا۔

سقراط یقین کرتا تھا کہ ایک انسان نیکی نہیں کر سکتا جب تک پہلے وہ یہ نہ جان لے کہ نیکی کیا ہے، گویا اخلاق کی بنیاد اُس نے علم پر قائم کی تھی اور اس لئے وہ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ اگر انسان واقعی علم رکھتا ہے تو اُس سے بدی سرزد نہیں ہو سکتی۔

اُس کا خیال تھا کہ انسان صرف اس وقت بدی کرتا ہے جب وہ علم سے بے بہرہ ہوتا ہے اور قصداً کبھی گناہ میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کوئی انسان ایسا ہے جو قصداً معصیت میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ اُس شخص سے اچھا ہی جو بغیر ارادہ کے ایسا کرتا ہے، سقراط نے اپنے اِس نظریہ میں اس کا مطلق خیال نہیں کیا کہ انسان کے بہت سے افعال جذبات کے ماتحت سرزد ہوتے ہیں اور ارسطو نے یہی اعتراض اُس کے نظریہ پر کیا ہے جس کا جواب دینا مشکل ہے حقیقت یہ ہے کہ سقراط جو کچھ کہتا تھا وہ صرف اپنے آپ کو دیکھ کر کہتا تھا اور چونکہ وہ خود جذباتی کمزوریوں سے بہت بلند پیدا ہوا تھا اس لئے وہ تمام انسانوں کو ایسا ہی سمجھتا تھا۔ یہ بات کسی طرح اُس کی سمجھ میں آ ہی نہ سکتی تھی کہ ایک شخص بری بات کو بری جان کر کیونکر اُس کا مرتکب ہو سکتا ہے۔

سقراط کے اس نظریہ سے لازماً دو نظریے اور پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ نیکی چونکہ علم کا دوسرا نام ہے اس لئے

وہ سکھائی جا سکتی ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نیکی کا تعلق انسان کی فطرت، وراثت نسلی اور ماحول سے ہے اور ہر چند تعلیم و مشق سے کچھ تغیر و تبدل ممکن ہے، لیکن بہ حیثیت مجموعی انسان اسی خصلت پر قایم رہتا ہے جو اُسکی فطرت ہے۔ مگر سقراط کے نزدیک نیکی کے وجود کے لئے صرف علم کی ضرورت ہے اور چونکہ علم سکھایا جا سکتا ہے اسلئے نیکی بھی سکھائی جا سکتی ہے۔

دوسرا نظریہ اس سے یہ پیدا ہوا کہ نیکی یا خوش اخلاقی خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو، ایک ہی چیز ہے، ہم انسان کی مختلف خوبیوں کا ذکر مختلف الفاظ سے کرتے ہیں مثلاً کسی کو ہم عقلمند کہتے ہیں، کسی کو محتاط، کسی کو رحمدل ظاہر کرتے ہیں، اور کسی کو فیاض۔ سقراط یہ کہتا ہے کہ انسان کی یہ تمام صفتیں علٰحدہ علٰحدہ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی ہیں اور ان سب کا ماخذ بھی وہی ایک چیز ہے جس کا نام علم ہے۔ یہ تھا مختصر بیان سقراط کے اُس نظریہ کا جو اُس کی تعلیمات کا اصل الاصول سمجھا جاتا ہے۔ اب اجمالاً یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ مفکرین کی تاریخ میں سقراط کا کیا مرتبہ ہے۔

فلسفۂ سقراط کے دو پہلو ہیں۔ پہلا یہ کہ اخلاق کا دوسرا نام علم ہے اور یہ اس کا علمی پہلو ہے۔ دوسرا پہلو اسکی اخلاقی تعلیمات کا ہے۔ لیکن سقراط کو جس چیز نے سقراط بنایا وہ اُس کا پہلا نظریہ ہے۔ کیونکہ اسی نظریہ نے دنیائے فلسفہ میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اسی پر افلاطون کے فلسفہ کی تمام تعمیر قایم ہوئی، ارسطو نے اسی کا تتبع کیا اور بعد کو تمام فلسفۂ تصوری یعنی (Idealism) کی بنیاد اسی پر استوار ہوئی۔

سقراط کے اِس نظریہ کا سب سے زیادہ نمایاں اور فوری اثر یہ ہوا کہ سوفسطائیوں کی تعلیمات خاک میں ملگئیں کیونکہ سوفسطائیوں کا نظریہ یہ تھا کہ صداقت یا نیکی کا تعلق انسان کے وجدان و احساس سے ہے اور چونکہ مختلف انسانوں کا وجدان ایک ہی چیز کے متعلق مختلف ہوا کرتا ہے۔ اس لئے نیکی یا صداقت کوئی متعین حقیقت نہ ہوئی بلکہ صرف وجدانی چیز ہوئی۔ سقراط نے اُس کی تردید کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ صداقت و نیکی کا تعلق وجدان و احساس سے نہیں بلکہ عقل و فراست سے ہے اور اس لئے کوئی شخص اپنی بد اخلاقی کے عذر میں اپنی فطرت یا اپنے وجدان کو پیش نہیں کر سکتا اور چونکہ علم سیکھنے سکھانے کی چیز ہے اس لئے اخلاق بھی اکتساب کیا جا سکتا ہے اور جو شخص اس کو نہ سیکھے وہ سوسائٹی کا مجرم ہے۔ الغرض سقراط نے اپنے اس نظریہ سے نیکی کے مفہوم کو اعتقادی چیز نہیں رکھا بلکہ اس کو ایک واقعیت میں تبدیل کر دیا، اور اس طرف ایک عام رجحان لوگوں کا ہو گیا۔ اسی کے ساتھ عملی نظریہ اسنے یہ پیش کیا کہ فکر و خیال کی برائیوں کا علاج یہی ہے کہ اور زیادہ فکر و خیال سے کام لیا جائے۔ اگر انسان کا ذہن اول اول ریب و شک میں مبتلا کرتا ہے تو اس کے معنے یہ نہیں کہ اس کو بُرا سمجھ کر ترک کر دیا جائے۔ بلکہ برابر غور کرتے رہنا چاہئے، یہاں تک کہ انسان کو اپنی عقل پر اعتماد کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ یہ تھا سقراط کا وہ طریق عمل جس پر بعد کو تمام مفکرین و متکلمین کاربند ہوئے

سقراط کے اس نظریہ نے سب سے زیادہ جس چیز کو متاثر کیا وہ مذہب تھا کیونکہ مذہب نام ہے صرف معتقدات کا جن میں عقل سے کام لینے کی ضرورت نہیں اور اگر کوئی شخص معتقدات مذہب میں عقل سے کام لینے کے بعد شکوک میں مبتلا ہوتا ہے تو ایسی عقل و فراست کو گمراہی سے تعبیر کر کے اُس سے احتراز کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ لیکن سقراط یہ کہتا ہے کہ عقل سے کام لینا کبھی نہ ترک کرنا چاہئے۔ کیونکہ یہ انسان کا فطری حق ہے اور اگر غور و فکر کے دوران میں وہم و شک کی منزل سامنے آئے تو اُس سے ڈر کر پیچھے نہ ہٹنا چاہئے بلکہ اور آگے بڑھنا چاہئے۔ یہاں تک کہ تاریکی دور ہو کر روشنی نمودار ہونے لگے خواہ وہ روشنی مذہب کی تائید کرنے والی ہو یا تردید کرنے والی۔

سقراط نے جو نظریے پیش کئے ہیں ان کے متعلق لوگوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں کہ اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز اس کی فصاحت و بلاغت تھی۔ افلاطون، ایسی بیاڈیز کی زبانی سقراط کی سحر کارانہ خطابت کا ذکر کرتا ہے کہ "سقراط کے الفاظ سنکر میرا دل اکثر رویا ہے، کیونکہ جب میں اُس کو سنتا ہوں تو میرا دل از خود رفتہ ہو کر دھڑکنے لگتا ہے اور اُس کی زبان کا ہر لفظ میری آنکھوں سے آنسو بنکر نکلتا ہے۔ میں نے بہت سے بے مثل خطیبوں کی تقریریں سنی ہیں لیکن میری روح میں اتنا احساس کبھی پیدا نہیں ہوا جتنا سقراط کی تقریر سن کر اور حقیقت یہ ہے کہ جو زندگی میں بسر کر رہا ہوں اُسے سقراط کی خوش بیانی ہی نے جینے کے قابل بنایا"

سقراط اپنی تقریر میں بہت محتاط تھا۔ چنانچہ وہ ایک جگہ کہتا ہے کہ "الفاظ کا غلط و غیر محدود استعمال نہ صرف یہ کہ بجائے خود ایک گناہ ہے بلکہ اس سے روح کی پاکیزگی کو بھی صدمہ پہونچتا ہے۔"

جس دن اس کو زہر پینا تھا اس سے قبل پوری رات اس نے اپنے اعزہ و احباب کی صحبت میں بسر کر دی اور شب بھر اپنے فلسفیانہ معتقدات پیش کرتا رہا۔ اسی سلسلہ میں موت کے متعلق جو خیال اسنے ظاہر کیا وہ سننے کے قابل ہے۔ کہتا ہے کہ موت دو حال سے خالی نہیں، یا تو مرنے کے بعد انسان کا وجود قطعی محو ہو جاتا ہے اور اس کا احساس بالکل زایل یا پھر عام عقیدہ کے مطابق موت نام ہے روح کے نقل مکانی کا۔ پھر اگر موت کا نتیجہ یہ ہے کہ حواس باقی نہ رہیں اور انسان پر ایک گہری نیند طاری ہو جائے تو اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔ اگر کسی شخص کو اپنی تمام زندگی میں ایک رات بھی ایسی میسر آجائے تو اسے اپنی عمر کی تمام راتوں کو اس پر قربان کر دینا چاہئے اور اگر موت کے معنی ہیں اس عالم سے انتقال اُس عالم میں جہاں سب بادہ خواران فنا منزل گزیں ہیں تو اس سے بڑھ کر نعمت اور کیا ہو سکتی ہے۔ میں مطمئن ہوں کہ مردے بھی ایک طرح کی ہستی رکھتے ہیں اور وہ ہستی بدرجہا خوشگوار ہے۔

سقراط جو بات کہتا تھا نہایت غور و فکر کے بعد اور کوشش کرتا تھا کہ مختصر سے مختصر الفاظ میں لیکن نہایت پرزور طریقہ سے اپنے خیالات ظاہر کرے۔ چنانچہ ایکبار کسی بداخلاق لیکن شریف شخص نے اُس سے پوچھا "اے سقراط، تم کو اپنی رذیل قوم سے نفرت نہیں ہے" اُس نے جواب دیا "تمہاری قوم کا تم پر خاتمہ ہو گیا۔ اور میری قوم کی ابتدا مجھ سے

ہوتی ہے"۔ ایکبار کسی آدمی نے اُس سے کہا کہ "شہر والوں سے جو گفتگو تم نے کی ہے وہ پسند نہ کی جاوے گی"۔ اُسنے کہا کہ "مجھے اس سے رنج نہیں ہوتا کہ میری بات نہیں مانی گئی بلکہ اس سے ہوتا ہے کہ میری بات صحیح نہ ہو"

تہذیب گفتگو کے متعلق سقراط کہتا ہے کہ "وہ شخص جو کسی بات سے واقف نہیں ہے اگر خاموش رہے تو دنیا سے اختلاف اُٹھ جائے"۔

تعلقات دنیاوی کے متعلق کہتا ہے "تعجب ہے اُس شخص پر جو دنیا کی بے ثباتی سے واقف ہے اور پھر بھی اُس کی طرف مائل ہو کر غیر فانی چیزوں کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے"۔

گفتگو میں احتیاط کا فلسفہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ "خدا نے آدمی کو ایک زبان دی ہے اور دو کان تاکہ وہ سنے زیادہ اور بولے کم"۔

علم کی وسعت اور اپنی نارسائی کا اظہار یوں کرتا ہے کہ "اگر میرے اس کہنے سے کہ "میں نہیں جانتا" لوگ یہ نہ سمجھتے کہ "میں جانتا ہوں" تو میں یہی کہتا کہ "میں نہیں جانتا"

نیند اور رات کی تعبیر ملاحظہ فرمائیے کہتا ہے "نیند ایک مختصر موت ہے اور موت طویل نیند"

نکتۂ رازداری پر اظہار خیال کرتا ہے کہ "اگر تمہارا راز تمہارے سینہ میں نہیں سما سکتا تو دوسرے کے سینہ میں کیسے سما سکے گا"۔

الغرض سقراط تمام مفکرین یونان میں ایک قائد اعظم کی حیثیت رکھتا تھا اور حکماء و فلاسفۂ قدیم میں سب سے پہلا شخص ہے جس نے تعلیم اخلاق کو ٹھوس علمی نظریہ پر قایم کیا۔

"نگار" کے پُرانے پرچے

حسب تفصیل ذیل دفتر میں موجود ہیں اور علاوہ محصول اس قیمت پر مل سکتے ہیں جو ان کے آگے درج ہے:۔

(۱۹۲۲ء) ستمبر ۴ر۔ (۱۹۲۳ء) مئی ۴ر۔ (۱۹۲۴ء) جنوری، فروری و اگست ۴ر فی پرچہ۔ (۱۹۲۶ء) جنوری، جون، اکتوبر و نومبر ۴ر فی پرچہ۔ (۱۹۲۷ء) اپریل، مئی و جون ۴ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۱ء) جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر نومبر و دسمبر ۴ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۳ء) جنوری (غالب نمبر) ۱۲ر۔ فروری تا دسمبر علاوہ اپریل ۴ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۴ء) فروری جولائی و اکتوبر ۶ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۵ء) جنوری (اُردو شاعری نمبر) ۶ر۔ (۱۹۳۶ء) جنوری (ہندی شاعری) ۸ر

منیجر نگار لکھنؤ

مالک کا بچّہ

(۱)

رے چرن بارہ برس کا تھا جب وہ ایک شخص کے یہاں ملازم ہوا۔ رے چرن اور اس کا مالک دونوں ایک قوم کے تھے۔ اس کو مالک کے چھوٹے بچہ کو کھلانے پر نوکر رکھا گیا تھا۔ بچہ کا نام انوکل تھا۔ چند سال گزرنے کے بعد بچہ نوکر کے پاس سے اسکول جانے کے لئے چھڑا لیا گیا۔ اسکول کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ کالج میں تعلیم حاصل کرنے لگا۔ اور کالج کی تعلیم ختم کر کے کچہری میں ملازم ہو گیا۔

جب تک انوکل کی شادی نہیں ہوئی تھی اسوقت تک ریچرن صرف اسی کا خادم تھا لیکن جب گھر میں بہو آگئیں تو اس نے دیکھا کہ اب ایک کے بجائے میرے دو مالک ہو گئے۔ حکومت پرانے مالک کے ہاتھ سے نکل کر تازہ مالک کے ہاتھ میں پہونچ گئی۔ مگر خیر۔ تھوڑے ہی دنوں کے اندر ایک اور نئی آمد نے اس حکومت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ انوکل کے یہاں بیٹا پیدا ہوا اور ریچرن نے اس کی اتنی خدمت کی کہ بچہ اسی کا ہو گیا۔ ریچرن چوبیسوں گھنٹے اس بچہ کو کھلاتا تھا، بچوں ہی کی زبان میں اس سے باتیں کیا کرتا تھا اور طرح طرح کی حرکتوں سے بچہ کو ہنسایا اور خوش کیا کرتا تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد جب بچہ گھٹنیوں چلنے لگا تو اکثر وہ دروازے کی چوکھٹ پر سے نیچے اُتر جاتا تھا۔ جب ریچرن اسے پکڑنے کو دوڑتا تو بچہ شرارت کے ساتھ چیخ کر بھاگنے کی کوشش کرتا تھا۔ ریچرن کو بچہ کی ذہانت اور ہوشیاری پر بہت حیرت تھی۔ وہ اکثر اس کی ماں سے کہا کرتا تھا کہ دیکھ لینا تمہارا بیٹا ایک دن جج ہو گا۔

جب بچہ پیروں چلنے لگا تو ریچرن سمجھا کہ انسان کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا ہے۔ جب بچہ اپنے باپ کو "ابا" ماں کو "اماں" اور ریچرن کو "چنّا" کہکر پکارنے لگا تو ریچرن کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ تمام دنیا کو جا کر یہ خوشخبری سنائے۔

اب ریچرن کو اپنی ہنرمندیاں اور کمالات بھی دکھانا ہوتے تھے۔ کبھی اسے گھوڑا بننا پڑتا تھا اور لگام دانتوں میں دبا کر چاروں ہاتھ پاؤں زمین پر ٹیک کر چلنا پڑتا تھا۔ کبھی اسے اپنے چھوٹے پہلوان سے کشتی لڑنا پڑتی تھی اور اگر کبھی وہ ننھے پہلوان کی چالاکی سے ہار کر گرتا نہیں تھا تو بچہ کو روتا دیکھ کر ہار جاتا تھا۔

یہ زمانہ تھا جب انوکل کا تبادلہ پدما دریا کے قریب کسی ضلع میں ہوگیا۔ کلکتہ سے روانہ ہونے کے بعد راستے میں اس نے اپنے لڑکے کو ایک بچوں کی گاڑی ایک ریشمی واسکٹ۔ ایک کامدار ٹوپی اور ایک کڑوں کی جوڑی خریدی تھی۔ جب دونوں میاں بیوی ٹہلنے جاتے تھے تو ریچرن نہایت فخر کے ساتھ بچہ کو کپڑے پہنا کر اور گاڑی میں بٹھا کر ساتھ لیجاتا تھا۔

برسات کی فصل آئی۔ اور روزانہ بارش میں ترقی ہونے لگی۔ جو دریا گرمی میں بالکل خشک پڑا تھا اب اپنے تیز دھارے سے گاؤں کے مکانوں کو اور غلہ کے کھیتوں کو تہ آب کرنے لگا۔ اکثر اوقات دریا کے کنارے دھماکوں کی آوازیں آیا کرتی تھیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ دریا کے کگارے پھٹ پھٹ کر پانی میں گر رہے ہیں۔

ایک روز قریب شام بارش رکی۔ ابر چھایا تھا۔ ہوا میں ٹھنڈک تھی۔ روشنی بہت گوارا تھی۔ ایسے نفیس اور روح فزا وقت میں ریچرن کے چھوٹے خود مختار حاکم کو گھر میں بیٹھا رہنا اچھا نہیں معلوم ہوا۔ حضور اپنی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئے ریچرن آہستہ آہستہ گاڑی کو ڈھکیلتا ہوا لے چلا۔ یہاں تک کہ وہ دریا کے کنارے دھان کے کھیتوں تک پہونچ گئے۔ نہ کسی کھیت میں کوئی آدمی نظر آتا تھا اور نہ دریا میں کوئی کشتی پڑی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ سامنے دریا کی موجوں کی روانی اور افق برابر کے ٹکڑوں کا ہوا میں پیرتے ہوئے جانا بہت دلکش منظر تھا۔ اس منظر میں غروب ہوتے ہوئے آفتاب کا سماں نہایت دلکش معلوم ہوتا تھا اور بے اختیار اپنی طرف دل کو متوجہ کئے لیتا تھا۔ اس عالم میں دفعتاً بچہ نے ایک طرف اُنگلی سے اشارہ کیا اور چلایا "چنّا۔ پول"۔

ریچرن نے اس طرف نظر کی جدھر بچے نے اشارہ کیا تھا۔ سامنے دور پر ایک درخت پھولوں سے لدا کھڑا تھا بچہ نے بڑی پر شوق نگاہوں سے اسے دیکھا اور ریچرن اس کی خواہش سمجھ گیا۔ چند ہی روز پیشتر کا یہ واقعہ ہے کہ اسی درخت کے پھول توڑ کر ریچرن نے بچہ کو دئے تھے اور اس کے بیج جمع کر کے اسے چھوٹی سی گاڑی بنا دی تھی اور اسمیں ایک ڈور باندھ دی تھی۔ بچہ اسے خوشی خوشی گھسیٹتا پھرتا تھا۔ وہ اس کھیل میں اتنا مشغول رہا کہ دن بھر ریچرن کو گھوڑا نہیں بننا پڑا۔ اُس روز اس کے عہدے میں ترقی ہو گئی تھی۔ اسے گھوڑے کے عہدے کے بجائے سائیس کا عہدہ مل گیا تھا مگر اسوقت ریچرن کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ میں پھچر پھچر کرتا ہو پھول توڑنے کے لئے جائے کیونکہ ابھی پانی برس کے کھلا تھا اور دریا کا کنارا تھا۔ لہذا اس نے دوسری طرف اُنگلی سے اشارہ کیا اور بچہ سے کہا "دیکھو وہ چڑیا۔ اابا"۔ یوں بچہ کو دوسری طرف متوجہ کر کے اس نے جلدی سے گاڑی کا رخ پھیر دیا اور درخت کے سامنے سے اس کو ہٹا دیا۔

مگر وہ بچہ جو کسی وقت میں جج ہونے والا ہو اس آسانی سے نہیں بہل سکتا اور اس سہولت سے دھوکے میں نہیں آسکتا۔ علاوہ اس کے ایک خیالی چڑیا کا تصور دیر تک قایم بھی نہیں رہ سکتا اور دوسری کوئی چیز ایسی سامنے

تھی بھی نہیں جو بچہ کی نظر اپنی طرف متوجہ کرتی۔ اس لئے ریچرن کی اس کوشش کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

تنہا مالک پھول لینے کے لئے ضد کر رہا تھا، ریچرن اسے بہلاتے بہلاتے تھک چکا تھا۔ جب وہ بچہ کی ضد سے مجبور ہو گیا تو اس نے کہا "اچھا بیٹا۔ تم چپکے گاڑی میں بیٹھے رہنا۔ میں ابھی پھول لیکے آتا ہوں۔ دیکھو پانی کے پاس نہ جانا۔" یہ کہکر اس نے رانوں تک اپنی دھوتی چڑھائی اور بدبودار دلدل میں پھچر پھچر کرتا ہوا درخت کی طرف چلا بچے کی نظر دریا کی طرف گئی۔ اس نے تیزی سے پانی بہتے ہوئے دیکھا۔ دھارا اتنا تیز تھا کہ پانی میں سے غرغر کی صدا آرہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ نافرمان موجیں ہزار بچوں کی طرح قہقہے مارتی ہوئی کسی ریچرن سے بھاگنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ موجوں کی یہ شرارت دیکھ کر بچہ کا دل بے چین ہو گیا۔ وہ چپکے سے گاڑی سے اترا اور دوڑتا ہوا دریا کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں اس نے ایک لکڑی اٹھالی۔ دریا کے کنارے بیٹھکر اس نے لکڑی پانی میں ڈالی اور مچھلی کے شکار کے لئے پانی کی طرف جھکا۔ دریا کی شریر پریاں اپنے دلکش قہقہوں کے ساتھ اس بچہ کو کھیل میں شریک ہونے کو بلا رہی تھیں۔

ریچرن نے مٹھی بھر پھول توڑے اور انھیں اپنی دھوتی کے پلو میں باندھ کر خوشی خوشی مسکراتا ہوا واپس ہوا لیکن جب وہ گاڑی کے قریب پہونچا تو دیکھا گاڑی خالی ہے۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف نظر کی مگر بچہ نظر نہیں آیا۔ پھر اس نے پلٹ کر گاڑی کی طرف دیکھا۔ اس میں کوئی نہ تھا۔ ریچرن بدحواس ہو گیا اس کے تمام جسم کا خون خشک ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا آگیا۔ نہایت اضطراب کے عالم میں اس نے پکارا "بھیا۔ بھیا۔"

مگر کسی آواز نے جواب میں "چنا" کہکر اسے نہیں پکارا۔ کسی بچہ کی قہقہہ مارنے کی آواز سنائی نہیں دی۔ صرف دریا کی موجوں کا شور اور غرغر کی صدا پہلے کی طرح کانوں میں آرہی تھی۔ گویا دریا کو کسی واقعہ کی خبر نہیں تھی۔ اور نہ اسے اتنی فرصت تھی کہ ایک بچہ کی موت کے معمولی واقعہ کی طرف توجہ کرنے میں ایک لمحہ وقت صرف کرتا۔

جب رات ہو گئی تو ریچرن کے مالکوں کو تشویش پیدا ہوئی۔ انھوں نے ہر طرف تلاش کے لئے آدمی دوڑائے۔ لوگ ہاتھوں میں لالٹینیں لئے ہوئے ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے پدما کے کنارے پہونچے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ ریچرن دیوانوں کی طرح کھیتوں میں دوڑ رہا ہے اور بیتابانہ "بھیا بھیا" چلا رہا ہے۔

لوگ اسے بہزار وقت مالک کے گھر واپس لائے۔ ریچرن آتے ہی اپنے مالک کی بیوی کے پیروں پہ گر پڑا۔ وہ اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بار بار پوچھتی رہیں کہ آخر تو نے بچہ کو کہاں چھوڑا تھا مگر اس کی زبان سے کچھ نہیں نکلا سوائے اسکے کہ "میں نہیں جانتا۔"

گو ہر شخص کا خیال تھا کہ بچہ پدما میں غرق ہو گیا ہے پھر بھی تھوڑا بہت شک ہر ایک کے دل میں باقی تھا اسی روز خانہ بدوشوں کا بھی ایک گروہ گاؤں کے قریب دیکھا گیا تھا لہذا یہ بھی خیال ہوتا تھا کہ شاید وہ چرا لے گئے ہوں ماں کے

صدمہ اور رنج کی تو یہ حد تھی کہ اسے خود ریچرن پر شک ہونے لگا۔ دماغی انتشار کی وجہ سے وہ سمجھنے لگی کہ ریچرن نے بچہ کو چرایا ہے۔ اسی بنا پر وہ ریچرن کو الگ لے گئی اور منت اس سے کہا "ریچرن۔ میرا بچہ مجھ کو دیدہ تم جتنا روپیہ مانگو میں دیدوں مگر میرا بچہ مجھے واپس کردو"۔

ریچرن بیچارہ جواب میں دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹتا تھا۔ مالک کی بیوی نے اسے گھر سے نکال دیا۔ انوکل نے بہت چاہا کہ بیوی کے دل سے یہ خیال نکال دے اور کہا "تم خود سوچو کہ آخر اس کا کیا نفع تھا جس کے لئے وہ اتنا شدید جرم کرتا۔ مگر بیوی نے کہا "کوئی کسی کے دل میں نہیں بیٹھا رہتا ہے۔ کون کسی کی نیت کو جانتا ہے۔ بچہ سونے کا زیور پہنے تھا"۔ اس خیال کے بعد اسے دلیل سے قایل کرنے کی کوشش عبث تھی۔

(۲)

ریچرن اپنے گاؤں چلا گیا۔ ابھی تک وہ لاولد تھا۔ اور اس کے یہاں اولاد ہونے کی امید بھی نہ تھی مگر سال کے آخر میں اس کی بیوی کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا اور ولادت کے بعد ہی بیوی مرگئی۔

اس بچہ کو دیکھ کر پہلے تو ریچرن کو بہت غصہ آیا کیونکہ اسے یہ وہم پیدا ہوا کہ شاید یہ بچہ نئے مالک کی قایم مقامی کرنے آیا ہے۔ اور اس نے خیال کیا کہ مالک کے بچہ پر ایسا سانحہ گزرنے کے بعد اپنے بچہ کو دیکھ کر خوش ہونا گناہ ہے۔ واقعی اگر ریچرن کی بیوہ بہن اس بچہ کی پرورش نہ کرتی تو غالباً وہ زندہ ہی نہ رہتا۔ لیکن رفتہ رفتہ ریچرن کے خیالات میں فرق پیدا ہوگیا۔

کچھ عرصہ کے بعد یہ بچہ بھی پہلے بچہ کی طرح پیروں چلنے لگا اور اسی طرح دروازے کی چوکھٹ پھاندھنے لگا اس کے چہرے پر ویسی ہی شوخی نظر آنے لگی۔ یہ بچہ بھی ویسا ہی ذہین اور سمجھدار معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آواز اسکی ہنسی اس کا رونا اس کی سب حرکتیں چھوٹے مالک کے مانند تھیں۔ جب ریچرن اپنے بچے کے رونے کی آواز سنتا تھا تو اس کا دل دھڑکنے لگتا تھا۔ اس کو یہ محسوس ہوتا تھا گویا چھوٹا مالک اپنے "چنا" کے کھو جانے سے رو رہا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد فیلنا (بچہ کا یہ نام ریچرن کی بہن نے رکھا تھا) بولنے بھی لگا۔ اسنے "ابا" اور "اماں" کہنا سیکھ لیا۔ جب ریچرن کے کانوں میں وہ آوازیں پہونچیں جن سے اس کے کان آشنا تھے اسوقت یہ راز کھلا۔ معلوم ہوتا ہے چھوٹا مالک اپنے "چنا" کو اتنا چاہتا تھا کہ اس کی جدائی گوارا نہ کرسکا اس لئے وہ دوبارہ اس کے گھر میں پیدا ہوا۔

ریچرن کے خیال میں اس امر کے ایسے ثبوت موجود تھے جن سے انکار کی کوئی گنجایش نہ تھی۔ ایک یہ کہ

مالک کے بچہ کی موت کے بعد ہی یہ بچہ پیدا ہوا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس کی بیوی کے یہاں جوانی میں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی پھر ادھیڑ عمر میں بچہ ہونے کے کیا معنی تھے۔ تیسرے یہ کہ یہ بچہ بھی پہلے بچہ کی طرح پیروں چلتا تھا اور "ابا" اور "اماں" کہکر پکارتا تھا۔ ہونے والے بچ کی کوئی علامت ایسی نہ تھی جو اس میں موجود نہو۔

اب ریچرن کو اپنے مالک کی بیوی کی بات یاد آئی۔ اس نے اپنے دل میں کہا "آہ۔ اسکی ماں ٹھیک کہتی تھی کہ میں نے اس کے بچہ کو چرایا ہے۔" جب وہ اپنے خیالات کی دہن میں اس نتیجہ پر پہونچا تو اسے اپنی گزشتہ لاپرواہی پر بہت ندامت ہوئی۔ اس نے ایک بچوں کی گاڑی خریدی۔ ایک ریشمی واسکٹ اور ایک کامدار ٹوپی خریدی۔ اور اپنی بیوی کا تمام زیور گلوا کر بچہ کے لئے کپڑے کی جوڑی بنوائی۔ اس نے اس بچہ کو گاؤں کے کسی بچہ کے ساتھ نہیں کھیلنے دیا بلکہ دن رات خود ہی اس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ یہ بچہ گاؤں کے تمام بچوں سے عمدہ کپڑے پہنے رہتا تھا اور ریچرن کی ناز برداری کی وجہ سے اس کا مزاج بھی ایسا ہوگیا تھا کہ گاؤں کے سب لڑکے اسے "حضور حضور" کہنے لگے۔ گاؤں کے جتنے بوڑھے تھے وہ سمجھتے تھے کہ ریچرن بچہ کی محبت میں دیوانہ ہوگیا ہے۔

اب بچہ کی عمر اسکول میں داخل کرنے کے قابل ہوگئی۔ ریچرن اپنی مختصر زمین بیچ کر کلکتہ چلا گیا۔ وہاں اس نے بہت کوشش کر کے ایک جگہ ملازمت کی اور لڑکے کو اسکول میں داخل کیا۔ اس نے بچہ کو اچھے سے اچھا کھانا کھلانے عمدہ سے عمدہ کپڑے پہنانے، اور بہتر سے بہتر تعلیم دلانے میں کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا نہ رکھا۔ خود بیچارہ صرف ایک مٹھی چاول پر قناعت کر کے زندگی بسر کرتا تھا اور برابر اپنے دل میں کہا کرتا تھا "آہ۔ میرے مالک تمھیں مجھ سے اتنی محبت تھی کہ آخر میں تم میرے ہی گھر میں چلے آئے۔ اب میں بھی تمھیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا اور کبھی تمھاری طرف سے غافل نہیں رہوں گا۔"

بارہ برس اور گزر گئے۔ لڑکا پڑھ لکھ کر فارغ ہوا۔ وہ خوشرو خوش مزاج اور تندرست تھا۔ کپڑے کا اس کو سب سے زیادہ شوق تھا۔ اسے اسراف کی عادت ہوگئی تھی اور بہت روپیہ خرچ کرتا تھا۔ اس نے ریچرن کو اپنا باپ نہیں سمجھا۔ ریچرن باپ کی طرح اس سے محبت کرتا تھا مگر اس کا برتاؤ نوکروں کا سا معلوم ہوتا تھا۔ دوسری خطا ریچرن سے یہ ہوئی تھی کہ وہ کسی پر یہ ظاہر بھی نہیں کرتا تھا کہ میں لڑکے کا باپ ہوں۔

ہوسٹل میں جہاں فیلنا رہتا تھا لڑکے ریچرن کے دیہاتی پن پر بہت مضحکہ کیا کرتے تھے اور فیلنا بھی ریچرن کے پیٹھ پیچھے لڑکوں کے مذاق میں شریک رہتا تھا۔ لیکن باوجود اس کے سب لڑکے اس نیک اور رحمدل بڈھے سے محبت بھی کرتے تھے۔ فیلنا کو بھی اس سے محبت تھی۔ مگر کیسی محبت؟ جیسی کسی کو اپنے پرانے وفادار ملازم سے ہوتی ہے۔

ریچرن اب بہت بوڑھا ہوگیا تھا۔ ضعیفی کی وجہ سے اب وہ کام کاج سے معذور ہونے لگا۔ ایک تو بوڑھاپا دوسرے لڑکے کے خیال سے اسے فاقے کرنا پڑتے تھے۔ لہذا اس کی طاقت نے بھی اسے جواب دیدیا تھا اور عقل نے بھی۔ مگر جو

شخص تنخواہ دیتا ہے اسے اس سے کب بحث ہوتی ہے۔ اسے تو اپنا کام پورا ہونے سے مطلب۔ وہ ملازم کی غلطیوں کو کہاں تک معاف کرتا۔

ریچرن اپنی زمین بیچکر جو روپیہ لایا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ اور لڑکا برابر اپنے خرچ کے لئے روپیہ مانگا کرتا تھا۔

(۳)

اب ریچرن نے کچھ اور ارادہ کیا۔ اس نے نوکری چھوڑ دی۔ اس نے تھوڑا سا روپیہ فیلنا کو خرچ کے لئے دیا اور کہا "میں ایک کام سے گاؤں جاتا ہوں بہت جلد واپس آجاؤں گا۔"

ریچرن سیدھا اس جگہ روانہ ہوگیا جہاں انوکل مجسٹریٹ تھا۔ انوکل کی بیوی کے دل پر ابتک بچہ کے ضائع ہونے کا غم باقی تھا۔ اس کے یہاں اور کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔

ایک دن انوکل کچہری سے تھکا ماندا آکر گھر پر ذرا آرام لے رہا تھا۔ اس کی بیوی ایک فقیر سے بہت زیادہ قیمت پر ایک دوا خرید رہی تھی جس کے بابت فقیر نے کہا تھا کہ اس کے کھانے سے تمھارے یہاں بچہ ہوگا۔ اتنے میں باہر کسی کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ انوکل اُٹھکر گیا تو دیکھا ریچرن کھڑا ہے۔ اپنے قدیم ملازم کو دیکھ کر اسے محبت کا جوش آگیا۔ اس نے ریچرن سے بہت سے سوالات کئے اور کہا کہ اب پھر میری ملازمت کرلو۔ ریچرن نے کھسیانہ ہوکر کہا کہ میں بہو صاحب کو سلام کرنا چاہتا ہوں۔

انوکل ریچرن کو ساتھ لئے ہوئے اندر چلا گیا۔ انوکل کی بیوی اس سے اس طرح نہیں ملی جس طرح اس کا مالک ملا تھا۔ ریچرن نے اس کا خیال نہیں کیا اور ہاتھ جوڑکر کہا "پدمانے آپ کے بچہ کو نہیں چرایا تھا بلکہ میں نے چرایا تھا۔"

انوکل نے گھبراکے پوچھا۔ "ہائیں! کیا کہا؟ وہ کہاں ہے؟"

ریچرن نے کہا۔ "وہ میرے ساتھ ہے۔ میں پرسوں اسے لے آؤں گا۔"

اتوار کا دن تھا۔ کچہری میں تعطیل تھی۔ صبح سویرے سے دونوں میاں بیوی ریچرن کے آنے کے منتظر تھے۔ دس بجے ریچرن فیلنا کا ہاتھ پکڑے ہوئے آیا۔

انوکل کی بیوی نے کچھ منہ سے نہیں کہا۔ اس نے دوڑکر لڑکے کو گود میں لے لیا۔ خوشی سے اس کی عجب حالت تھی کبھی ہنستی تھی کبھی روتی تھی۔ کبھی اس کی پیشانی کے بوسے لیتی تھی۔ کبھی بغور اس کے چہرے کو دیکھنے لگتی تھی۔

لڑکا شکیل اور خوبصورت تھا۔ اور شریف آدمیوں کے سے کپڑے پہنے تھا۔ انوکل کا دل بھی جوش اُلفت سے بھر آیا۔ مگر اس نے ریچرن سے پوچھا "تم کہتے ہو کہ یہ لڑکا میرا ہے۔ تمھارے پاس کیا ثبوت ہے؟"

ریچرن نے کہا "اس کا ثبوت میں کیونکر دے سکتا ہوں۔ بس خدا ہی جانتا ہے کہ میں نے آپ کے بچہ کو چُرایا تھا

دنیا میں کوئی شخص اسے نہیں جانتا۔"

جب انوکل نے دیکھا کہ اس کی بیوی لڑکے کو محبت سے گلے لگائے ہے تو اسنے ثبوت طلب کرنے کو عبث سمجھا اس نے خیال کیا کہ یقین کر لینا ہی مناسب ہے۔ دوسری بات یہ کہ ریچرن کو ایسا بچہ کہاں سے ملجاتا جسے وہ میرا کہکر مجھے لاکے دیتا۔ اور نیز یہ کہ بڈھے آدمی کو مجھے دھوکا دینے میں کیا فایدہ ہے۔

ریچرن نے ہاتھ جوڑ کے منت سے کہا " مالک اب میں آپ کی چوکھٹ چھوڑ کے کہاں جاؤں۔ بڈھے آدمی کو کون نوکر رکھے گا؟"

انوکل کی بیوی نے اپنے میاں سے کہا " رکھ لو اسے۔ میرا بچہ خوش ہوگا۔ میں اسے معاف کرتی ہوں "

مگر انوکل کا ضمیر اب اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس نے کہا " نہیں۔ ایسا مجرم معافی کے قابل نہیں ہے"

ریچرن جھکا اور انوکل کے پاؤں چوم کر بولا۔ " مالک مجھے یہاں پڑا رہنے دیجئے۔ یہ میرا کام نہ تھا۔ بلکہ خدا ہی کو یہ منظور تھا۔"

انوکل کو اور زیادہ ناگوار ہوا کہ ریچرن اپنے جرم کا الزام خدا پر عاید کر رہا ہے۔ لہذا اس نے کہا " نہیں اب میں تمھیں رہنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ اب مجھے تم پر بالکل اعتبار نہیں ہے۔ تم نے بڑا فریب دیا ہے۔"

ریچرن نے ہاتھ جوڑ کر کہا " مالک یقین مانئے یہ میرا کام نہ تھا۔"

انوکل ۔ " پھر کس کا کام تھا؟"

ریچرن ۔ " یہ قسمت کا کام تھا۔"

مگر کوئی تعلیمیافتہ آدمی ایسے جرم کی صفائی میں قسمت کے عذر کو قبول نہیں کر سکتا۔ انوکل کو بالکل رحم نہیں آیا۔

جب فیلنا نے یہ دیکھا کہ میں ریچرن کا لڑکا نہیں ہوں بلکہ ایک دولتمند مجسٹریٹ کا بیٹا ہوں تو پہلے تو اسے بہت غصہ آیا کہ مجھے دھوکا دیا گیا اور اتنی مدت تک میری پیدایش کے حق سے محروم رکھا گیا۔ مگر پھر ریچرن کی مصیبت کو دیکھ کر اس کا دل نرم ہوا اور اس نے انوکل سے کہا " بابا۔ اسے معاف کر دیجئے۔ اچھا اگر اسے اپنے یہاں نہیں رکھتے ہیں تو کم از کم اس کی کچھ تنخواہ مقرر کر دیجئے۔"

یہ سنکر ریچرن نے اپنے لڑکے کے چہرے پر آخری نگاہ ڈالی اور ایک آہ سرد بھری۔ پھر مالکوں کو ادب سے سلام کیا اور چلا گیا۔

جب مہینہ ختم ہوا تو انوکل نے ریچرن کے لئے کچھ روپیہ بھیجا مگر گاؤں میں اس نام کا کوئی شخص نہ ملا۔

یوسف حسین زیدی

ہمارے بزرگانِ ملت

آرہ کے چند خوش ذوق نوجوانوں نے ایک انجمن قایم کی ہے جس کا مقصد "ادب اُردو" کی خدمت ہے جناب عبدالقادر سحر اس کے سکریٹری ہیں اور ہمارے فاضل دوست مولوی عبدالمالک صاحب اسکے روح رواں۔ اس کے پہلے جلسہ میں مولوی عبدالمالک صاحب نے جو مقالہ پڑھا تھا وہ زراہ کرم نگار کو مرحمت فرمایا گیا ہے چنانچہ ہم بہ صد تشکر و امتنان اس کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔

مذہبی پیشواؤں اور دینی علما پر تعریض صرف کرنی، ان کی شان میں طنز و شوخی کے کلمات استعمال کرنا، شعر و سخن کا موضوع تھا اس ادبی معصیت سے نہ کوئی صوفی شاعر بچا ہوا تھا اور نہ رند شاعر، ادبیات کا مطالعہ کرنے کے بعد انسان اسی نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ لاابالی شاعر اور دیندار عالم کا کبھی نباہ نہوا، حزیں کہتے ہیں:۔

زاہد خشک ما منکر برہمن مشو — بے خبر از حقیقتے روشنی مجاز را

شیخ علی بن ابی طالب ایک مذہبی عالم بھی تھے، دینداروں کی آغوش میں تربیت پائی تھی چچا اور والد علمائے برگزیدہ میں سے تھے، حضرت زاہد الجیلانی کی اولاد! اور وہ محض اس الزام پر کہ کوئی پرہیزگار آدمی برہمن کی حقانیت تسلیم نہیں کرتا اس کو حقیقت سے بے خبر اور مجاز کی روشنی سے محروم بتاتے ہیں۔

طنز و استہزا کا یہ سلسلہ اگر شعر و سخن ہی تک محدود رہتا تو کوئی اعتراض کی بات نہ تھی کیونکہ رسم و رواج کی تقلید سے ادب کا دامن ہمیشہ ملوث رہا ہے مگر کس قدر اندوہ و ملال کی بات ہے جب ادب و انشا سے گزر کر سنجیدہ تحریروں میں علمائے ملت کی شان میں شوخیاں کی جاتی ہیں ان پر تعریضیں صرف کی جاتی ہیں اور اب یہ منزل آگئی ہے کہ سوسائٹی کے اندر روزانہ زندگی کی تمثیل میں ارباب قلم اس برگزیدہ طبقہ کو مسخرہ (Clown) کے روپ میں پیش کرتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے علما و صوفیہ "رسوا سر بازارے" ہو کر رہ گئے ہیں اب نہ ان کی قیادت ملی باقی ہے نہ سیادت مذہبی اس کا قدرتی اثر یہ ہوا کہ قایدین مذہب کے زوال سے ارباب ملت کے اندر دینی انحطاط ہونے لگا اور مذہب کا احترام اور دین کی ہیبت قلوب سے محو ہونے لگی اب سوال یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری تمام تر عہد حاضر کے الحاد کوش

طبقہ پر عائد ہوتی ہے یا ان علم برداران مذہب پر جن کی بے راہروی نے "تغییر حال" پیدا کر دی ہے۔

تاریخ اور تذکروں کے اوراق ان حقایق سے مالا مال ہیں کہ ادب نواز سلاطین و امرا نے علم و فن کی قدر کی اور فنی کمال کی قدر کے ساتھ علماء و فضلا کی عظمت و تقدیس کا بھی عام رواج رہا علمی و فنی کمال کی قدر کا یہ دائرہ محض شعر و ادب تک محدود نہ تھا بلکہ مذہبیات کے ماہرین بھی اس نوازش بیکراں کے مستحق تھے، اگر ہم ایک طرف یہ پڑھتے ہیں کہ افضل الدین خاقانی منوچہر شروان شاہ کے سامنے سونے کی کرسی پر بیٹھتا تھا[1]۔ نظیری کو "فن زرگری" میں مہارت تامہ تھی[2]، ظہوری کو برہان نظام شاہ اور ابراہیم عادل شاہ نے ہاتھی مع سامان اور لاکھوں روپیہ نقد و جنس بطور انعام دیا[3]۔ ابو طالب کلیم کو شاہجہاں نے دو مرتبہ سونے سے تولا[4]، تو ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لا عبد الحکیم سیالکوٹی کو بھی اس نے دو مرتبہ وزن کیا، اور جن نقود و اجناس سے تولا، سب ان کو عطا کر دیا اور بہت سے گاؤں بھی دئے[5]، نہ صرف یہ بلکہ سلاطین و امرا، علمائے دین کے آستانوں پر جبہ سائیاں کرتے ان کی کفش برداری کو اپنا فخر جانتے، ہدایے و تحایف بھیجتے لیکن وہی متدین علمائے مذہب جن پر آج پھبتیاں کی جاتی ہیں جن کو ادب فکاہی کا موضوع قرار دیا گیا ہے، اپنی سادہ و پر خلوص زندگی، اپنی ایثار پیشگی اور زاہدانہ رجحان اپنی بے نیازی اور بلند ظرفی کی بنا پر نہ صرف یہ کہ بادشاہوں کے نذرانوں کو مسترد کر دیتے تھے، بلکہ ان کی صحبت سے بھی متنفر تھے، حضرت ابو عبد اللہ محمد ماغوش تونسی کو سلطان سلیمان دعوت قیام دیتا ہے لیکن آپ قبول نہیں فرماتے، شیخ ابو الحسن خرقانی[6] کے آستانہ پر سلطان محمود جیسا رفیع الشان اور صاحب جلال بادشاہ جاتا ہے آپ تعظیم کے لئے نہیں اُٹھتے، تاریخ میں آپ کو محدثین و فقہا کی ایسی متعدد حکایات ملیں گی جن سے واضح ہوگا کہ عہد ماضی میں سوسائٹی کے اندر علما کی کیا قدر و قیمت تھی ابن مبارک محدث بغداد میں آئے تو لوگوں نے بڑا ہجوم کیا آدمیوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، زبیدہ نے محل سے یہ ہنگامہ زا منظر دیکھا تو دریافت کیا کہ کیا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ خراسان کے ایک عالم آئے ہیں اس نے کہا کہ بادشاہ دراصل یہ ہیں نہ کہ ہارون[7]!

آج علما کی مجلسوں میں جایئے آپ مشکل سے کسی وقار کا ملاحظہ کریں گے وہی خوشی میں منہ پھاڑ پھاڑ کر ہنسنا، اور غصہ میں اسی طرح ناک بھویں چڑھا کر بھونکنا، اس سے نہ کسی "جمعیت کا ناظم" بچا ہوا ہے، اور نہ کسی درگاہ کا سجادہ نشین۔ کوئی قومی مسئلہ ہو تو ایک ناظم اور ایک پیر بہت درد مند نظر آتا ہے کیونکہ پارٹی کی سرداری اور سیاسی رتق و فتق کی طمع اس کے جذبۂ قوم پرستی کو بہت زیادہ متحرک کر دیتی ہے، لیکن یہی پیر اپنے کسی پڑوسی (غیر برادری)

---

[1] صحف ابراہیم۔ [2] مجمع النفایس خان آرزو۔ [3] مآثر رحیمی و صحف ابراہیم۔ [4] کلمات الشعرا مرزا افضل سرخوش (قلمی نسخہ) [5] سبحۃ المرجان مؤلفہ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی۔ [6] تاریخ فرشتہ (ذکر سلطان محمود)۔ [7] بستان المحدثین۔

کے درد و دکھ میں شریک نہیں ہوتا، کوئی مرجائے تو جنازہ میں شرکت نہیں کرتا۔ کوئی بیمار پڑے تو عیادت کے لئے نہیں جاتا، ایک بلانوش کی طرح چائے کی پیالیاں خالی کئے جاتا ہے اور خادم کو محض اس بنا پر کہ اس نے شکر زیادہ ڈالدی تھی، یا رنگ جامی کے "کاس حمیرانا" کی طرح ارغوانی نہ تھا، ہر سزا دینے کے لئے طیار ہو جاتا ہے۔ مہی گاؤ تکیہ اور موٹی بھدی کلائی میں گھڑی کی تہمت تزیین، خدا جانے اسوقت یہ "دنیا پرست دیندار" اندر بھا کا عفریت بنجاتا ہے، یا ٹیٹو ٹانک خرافیات کا وہ عاشق زار دیو جو فریجہ دیوی پر مٹا ہوا تھا۔

علما و صوفیہ آج بھی ملی قیادت کا ادعا رکھتے ہیں اور ان کو شکایت ہے کہ خلقت ان کے مواعظ سننے کے لئے تیار نہیں اب ان کا وہ اثر و رسوخ نہیں رہا جو پہلے تھا دنیا میں بددینی پھیل گئی لوگ مذہب سے دور ہو گئے لیکن وہ اپنے گریبان میں منہ ڈالکر کبھی اپنی زندگی کا جایزہ نہیں لیتے کہ اگلے علما و صوفیہ کا کیا کردار تھا اور یہ انسانیت کشی اور اخلاق دشمنی میں اپنی منزل سے کتنی دور چلے گئے ہیں، آج علما کی مجلسوں میں ابراہیم بن جعفر اللوانی، اور احمد بن منذر اشبیلی، کی مجلسی شان کیوں نظر نہیں آتی، آج کوئی عالم مرتا ہے تو ابن التبان کی موت کی طرح سڑکیں اور گلیاں خلق اللہ سے کیوں نہیں بھر جائیں، اس لئے کہ اگلے علما، بادشاہوں کے نذرانے رد کرتے تھے، اور آج ہم وظایف کے لئے ریاستوں کی خاک چھانتے پھرتے ہیں، اگلے علما سلاطین کی صحبت سے بھاگتے تھے، اور آج امرا پرستی و اکابر نوازی ہر عالم و صوفی کا مطمح نظر ہے، اگلے علما، اہل دنیا کے قلوب میں گھر کئے ہوئے تھے عوام بلا امتیاز ان کے ساتھ ارادت و عقیدت رکھتے تھے، ان کا احترام کرتے تھے، ان سے ہیبت رکھتے تھے لیکن عہد حاضر کا عالم ان تمام مراعات سے محروم ہے۔

علما چاہتے ہیں لوگ ان کا احترام کریں لیکن وہ بالکل نہیں جانتے کہ جذبہ احترام کی تحریک کن اسباب کی بنا پر ہوتی ہے، عہد حاضر کا مشہور عالم نفسیات پروفیسر میک ڈاؤگل کہتا ہے کہ "نہیں"، محض "علامہ" بنجانے اور مختلف اداروں میں اپنے "چیلوں" کو سرفراز کر دینے، کے بعد اپنی عربیت و ادب دانی کا پروپیگنڈا کرنے سے نہ کوئی علامہ ہو سکتا ہے اور نہ اُس نیایش قلوب کا مستحق، اسی طرح ایک سجادہ نشین محض عرس کی بنگامہ زا مجالس برپا کرنے مریدوں کو سال میں ایک مرتبہ جی کھولکر پلاؤ قلیہ کھلا دینے اور بوریائے تقدس پر بیٹھ کر جس پر ہزاروں فراعنہ کا غرور و پندار قربان کیا جا سکتا ہے خلاف سنت عبادت کرنے سے ہمارے اندر احترام و وقار کی کیفیت نہیں پیدا کر سکتا پروفیسر نکلسن کا خیال ہے، کہ صوفیہ گو اپنے تعطل و جمود، اپنی تن آسانی اور اجتماعی زندگی کے خار زاروں سے دامن چینی کی بنا پر "قومی ترقی کو چوس لیتے ہیں لیکن ان کا اخلاقی پایہ ان کے اس نقص کی تلافی کر دیتا ہے" لیکن اب تو یہ بھی نہیں رہا۔ غالب اپنے خاص طنزیاتی رنگ میں کہتا ہے:۔

دہ دار و بت پرستی عیب و عار خود پرستیدن خدا توفیق کیش کفر بخشد دین پناہاں را

عہد حاضر کے صوفیہ اپنی خاندانی روایات کے غرور، جاہ طلبی اور زر پرستی کی بنا پر "خود پرستی" کی اس منزل پر پہونچ گئے ہیں کہ ان کی دین پناہیاں بہت سی کفر سامانیوں کو شرما سکتی ہیں، علما اور صوفیہ اگر اپنا حقیقی وقار چاہتے ہیں تو ان کو اس نفسیاتی راز کی طرف توجہ کرنی پڑے گی کہ جس طرح اگلے محدثین و بزرگان ملت شاہد علم پر فدا ہو گئے علوم و فنون کی تحصیل میں خون و پسینہ ایک کیا اور منزل کمال تک پہونچے اسی طرح ان کو بھی علم کا شیفتہ ہونا پڑے گا اور "نمود قابلیت" Pedantry سے احتراز کرنا ہوگا آپ علامہ ہیں تو ہوا کریں، صوفی ہیں، ہونگے ہیئت اجتماعیہ سے احترام یا اس سے ایک منزل اور آگے بڑھکر Reverance کے خواستگار ہیں تو آپ کو اپنی افادیت کا ثبوت دینا ہوگا، بے لاگ خدمت کرنی پڑے گی صلہ کی ہوس کو چھوڑنا پڑے گا۔ اپنے اخلاق کی بلندی اور انداز کی سادگی، اپنے کمال للہیت، فیاضانہ ربوبیت و سبانت، خلوص و ایثار سے لوگوں کے اندر جذبات تشکر و احساس کمتری کی تحریک کرنی پڑے گی ——— {اور چونکہ یہ ہونا نہیں اس لئے نتیجہ معلوم (نیاز)}

عبدالمالک آروی

آئندہ جنوری ۳۸ء کا "نگار"

دو چند ضخامت کے ساتھ صرف ایک موضوع پر شایع ہوگا

اور موضوع بھی وہ جو نہایت اہم ہے — یعنی — اسلامی ہند کی تاریخ

اڈیٹر نگار کے قلم سے

تاریخ تین یا چار قسطوں میں مکمل ہو جائے گی اور اس کی پہلی قسط جنوری ۳۸ء کے نگار میں شایع ہوگی "اسلامی ہند کی تاریخ" بالکل جدید اصول پر نہایت کاوش و تحقیق سے لکھی گئی ہے۔ اس میں تمام تاریخی ماخذوں سے بھی بحث کی گئی ہے اور ان مقامات کی جغرافی تحقیق بھی اس میں پائی جاتی ہے جن کا نام تاریخوں میں نظر آتا ہے لیکن ان کی تعیین بہت کم کی گئی ہے۔

"اڈیٹر نگار کا بے مثل تاریخی کارنامہ"

اگر دیکھنا ہو تو جنوری ۳۸ء کا "نگار" ضرور حاصل کیجئے اور اپنے حلقۂ احباب میں بھی اس کے خریدار پیدا کیجئے۔ قیمت فی کاپی دو روپیہ۔ نگار کے سالانہ خریداروں کو اسی سالانہ چندہ میں ملے گا۔ ششماہی خریدار اس رعایت سے فایدہ نہ اٹھا سکیں گے۔

مینجر نگار لکھنؤ

انتقادیات

ادبی جد و جہد کے سلسلہ میں تنقید ایک ممیز شعبہ ہے، اور وہ "ادبی تخلیق" اور "ادبی انبساط" کو حقیقت مانکر آگے بڑھتی ہے۔ اگرچہ "تخلیق" یا "انبساط" کی جگہ وہ خود تو نہیں لے سکتی لیکن اُن کی اعانت ضرور کرتی ہے تنقید کا وجود اپنی جگہ مستقل وجود ہے اور وہ دو صورتیں اختیار کر سکتی ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ وہ ادب کے عمومی مقصد (General function) سے بحث کر کے "نظریۂ ادب" کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ دوسری صورت میں اس کا موضوع صرف ادبی حسن و قبح (Merits) پر گفتگو کرنا ہوتا ہے۔ اس شکل میں اس کو "نقد محض" کا نام دیا جائے گا۔ مگر تنقید کی یہ دونوں صورتیں باہمد گر مخلوط اور لازمی طور پر ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔

حکیم سقراط نے اپنے ججوں کے سامنے اپنی غیر ہر دلعزیزی کے اسباب بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ "دنیا نے جن لوگوں کو حکیم و فرزانہ کا لقب دیا ہے، میں نے جب ان کی حکمت و فرزانگی کی تحقیق کی تو مجھے سخت مایوسی ہوئی"۔ پھر اسی تحقیق کے ذیل میں شعراء کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اپنے ججوں کو بتایا کہ:۔

"آپ لوگوں کے سامنے مجھے حقیقت ظاہر کرتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میں نے اُن نظموں کا انتخاب کر کے جو نہایت ہی توجہ اور احتیاط سے لکھی گئی تھیں، شعراء سے سوال کیا کہ ان نظموں کا "مفہوم" کیا ہے لیکن ان میں سے کوئی جواب دے سکا درانحالیکہ جو دوسرے لوگ وہاں موجود تھے ان میں سے غالباً ایسا کوئی نہ ہوگا جو اُن نظموں کے متعلق خود ان شعراء کے مقابلہ میں بہتر طور پر گفتگو نہ کر سکتا ہو"

یہ سوال قایم کر کے سقراط نے فی الحقیقت ایک نہایت اعلیٰ و اہم انکشاف کیا۔ اور ہمیں ماننا پڑے گا کہ سقراط پہلا شخص تھا جس نے "تخلیق ادب" اور "نقد ادب" میں امتیاز قایم کیا۔ سقراط اسی سلسلہ میں آگے چل کر کہتا ہے:۔

"مجھے جلد معلوم ہو گیا کہ شعر گوئی، شاعروں کے عقلمند و فرزانہ ہونے پر منحصر نہیں، بلکہ اس کی بنا شعراء کی ایک خصوصیت خاصہ (Special nature) یا خطابت پر ہے جس میں ولولہ و سرگرمی (Enthusiasm) کی صلاحیت ہوتی ہے (آج کل کی اصطلاح میں اس کو الہام سے تعبیر کیا جاتا ہے)۔ اس اعتبار سے شاعروں کی مثال کاہنوں یا پیغمبروں کی سی ہے جو کہتے تو عمدہ عمدہ باتیں ہیں لیکن خود نہیں سمجھتے"

سقراط یہ سوال کرکے کہ شعراء اپنی نظموں کا "مفہوم" بتائیں، دراصل اُن کا اُس چیز میں امتحان لے رہا تھا جسے وہ "دانشمندی یا فرزانگی" سے تعبیر کرتا تھا۔ یعنی تجزیہ کرنے کی عقلی (Rationale) طاقت جو ذہنی اصول کے بالکل مطابق ہو۔ بالفاظ دیگر وہ اُن کو انھیں کی شاعری پر تنقید کی دعوت دے رہا تھا۔ لیکن وہ اس کے اہل ثابت نہ ہوئے۔

اگر ضروری ہوتا تو ان شعراء کو سقراط یہ بھی بتاتا کہ شعر سے انبساط حاصل کرنے کی طاقت، اس طاقت سے یکسر جدا چیز ہے جو شعر کا تجزیہ عقلی طور پر کرتی ہے یعنی شعر گوئی کی طاقت کی طرح شعر سے انبساط حاصل کرنے کی طاقت کا مخرج بھی طبیعت کا ایک خاص انداز ہے۔ اور اگر ان دونوں کا فرق بتایا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک میں پرواز محبت متاثرانہ (Passive) حیثیت رکھتی ہے اور دوسری میں موثرانہ (Active)۔ بہرحال یہ دونوں طاقتیں بین طور پر مختلف ہیں اور ان دونوں طاقتوں کے ساتھ تیسری طاقت یعنی "نقد" کو بھی شامل کرنا ضروری ہے۔

جس دن سے انسان کو اس بات کا شعور ہوا کہ صناعت ادب میں ایک ایسا میدان اس کے تصرف میں آگیا ہے کہ وہ اپنی نہایت دلچسپ کارآمد قوتوں (Energies) سے کام لے سکتا ہے، اسوقت سے لوگ نہ صرف یہ سوال کرتے رہے ہیں کہ نظموں کا "مفہوم" کیا ہے، بلکہ ایسے مختلف سوال کرتے رہے ہیں جو ٹھیک عنوان انتقاد کے تحت آتے ہیں۔ سقراط کی تصنیف "اعتذار" (Apology) کو جو چیز تاریخ انتقاد کا سب سے پہلا میل راہ ثابت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے پہلی بار صاف طور سے بتایا کہ انتقاد ادبیات کا ایک ممیز شعبہ ہے۔

چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مملکت ادب پر تین قسم کی جداگانہ جدوجہد کا تصرف ہے۔ تخلیق کی طاقت حصول انبساط کی طاقت، اور انتقاد کی طاقت۔ انتقاد کی طاقت کو دوسری دونوں طاقتوں سے جدا کرنے والی خصوصیت صرف یہ ہے کہ انتقاد کی طاقت اکتساب کی جاسکتی ہے یعنی اگر طاقت انتقاد ہی ہو تب بھی ناقد کو اُس طریق عمل (Process) کا شعور ناگزیر ہے جس کے ذریعہ سے وہ نقد کرتا ہے، اور نقد کا یہ طریق عمل صرف ذہنی اصول سے واسطہ رکھتا ہے جو ایک باقاعدہ نظام میں مرتب کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن آپ کو ایسے اُصول کہیں نہ ملیں گے جو یہ بتاتے ہوں کہ ادب پیدا کس طرح کیا جاتا ہے، اور ادب سے انبساط کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ تنقید اس نفسی حالت کی توجیہ کی کبھی مدعی نہیں ہوسکتی جس سے ادب کی تخلیق یا حصول انبساط ممکن ہے، چہ جائیکہ اُسے اس قسم کی نفسی حالت پیدا کرنے کا ادعا ہو جس کا وجود پہلے سے نہ ہو۔ تنقید ان حالتوں کے وجود کو مان کر چلتی ہے کیونکہ ایسے شخص کے لئے جو نہ ادب کو خلق کرسکتا ہو اور نہ اسے انبساط حاصل ہوسکتا ہو، تنقید بالکل بے معنی چیز ہوگی۔ تنقید پہلے اس حقیقت کو مان لیتی ہے کہ ادب کا وجود ہے اور پھر اس کی نوعیت کی تحقیق شروع کرتی ہے، تاکہ اس کی شرح کرے، اس کی صحیح قیمت کا اندازہ کرے، یا اس کے متعلق صاف صاف سوچ سکے۔

جیسا کہ حکیم سقراط نے واضح کیا ہے "نقد" وہ چیز ہے جو تخلیق ادب کی طاقت سے بالکل الگ ہے، اور اگر

اس کے موضوع سے خارج نہ ہوتا تو قراط یہ بھی بتاتا کہ وہ حصول انبساط کی طاقت سے بھی بالکل جدا چیز ہے۔ بایں ہمہ اس میں کلام نہیں کہ طاقت نقد دہ ی دونوں طاقتوں میں سے کسی کے ساتھ ساتھ وجود میں آسکتی ہے۔ حکیم سقراط کو ان شعراء نے مایوس ضرور کیا، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ عہد سقراط کے تمام شاعر ایسے نہ رہے ہونگے جو اپنی نظموں کا "مفہوم" بتانے سے قاصر رہیں جو شعراء سقراط کو اپنی نظموں کا "مفہوم" نہ بتا سکے، وہ شاید خود سقراط کے سوال کا "مفہوم" ہی نہ سمجھے ہوں، یا ان کے نزدیک صرف یہی جواب کافی ہو کہ ایک نظم کا "مفہوم" خود اس کا وجود ہے۔

بلاشبہ ادب کی ترکیب (Composition) غیر انتقادی ہو سکتی ہے (یعنی یہ ضروری نہیں کہ جو شخص ادب پیدا کرے وہ اس پر نقد بھی کرتا ہو) اور کوئی شک نہیں کہ حصول انبساط بھی بالکل غیر انتقادی ہو سکتا ہے (یعنی لازمی نہیں کہ شعر سے لطف اٹھانے کے لئے اس پر نقد بھی کیا جائے)، لیکن یہ نہایت شاذ و نادر صورت ہے۔ ایک شخص کے اس احساس کے ساتھ کہ ایک بات کو اس طرح نہیں اس طرح کہنا مناسب ہوگا، اور وہ اس چیز کو اس چیز پر ترجیح دیتا ہے، نقد کی ابتدا ہو جاتی ہے، اسی سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ نقد کا آغاز ادب کی ابتدا کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ لیکن ادبیات میں تنقید کی مستقل حیثیت اسوقت سے شروع ہوتی ہے جب عقلی توجیہ سے کام لیا جائے اور ذہنی چھان بین صرف کی جائے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تنقید کا ذہنی اصول کے مطابق ہونا کیا فایدہ دیتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک انسان کے سوچنے کا تعلق ہے، بعض لوگ چاہتے ہیں کہ وہ امکانی حد تک نہایت تدبر کے ساتھ اور صاف صاف سوچ سکیں اور اس طرح یہ ایک نوع کی مشق ذہانت ہے اور دوسرا فایدہ یہ ہے کہ جس آدمی میں تخلیق ادب کی قوت ہوتی ہے، وہ تنقید کی قوت کو ذہانت کے ساتھ بکار استعمال پر قادر ہو جاتا ہے۔

"تخلیق" اور "حصول انبساط" سے قطع نظر کر لیا جائے تو تنقید ادب چند عقلی سوال و جواب پر مشتمل ہوتی ہے اور یہ سوال اپنی نوعیت کے مطابق دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک قسم وہ ہے جو عام ادب سے بحث کر کے کسی خاص ادب پارے کے متعلق گفتگو کرتی ہے اور دوسری قسم میں اس کے بالکل برعکس ہے۔ پہلی قسم کی تحقیق میں ہم ادب کو بھی ایک خاص نوع کی شے قرار دے لیتے اور سوچتے ہیں کہ ہم ادب کا من حیث الکل جائزہ کیوں لیتے ہیں؟ لفظ "ادب" کا مفہوم کیا ہے؟ اور اسکے مشترک خصوصیات کیا ہیں جن کی بنا پر ادب کا وجود من حیث الادب قایم ہے؟ اور سب سے بالاتر یہ کہ ادب کا مقصود کیا ہے اس تمام تحقیق کے نتائج کو ایک ایسے نظام اصول کی شکل میں مرتب کیا جا سکتا ہے جو اس بات کا اظہار کرے کہ ہم نوعیت ادب کو کس طرح سمجھے ہیں۔ ادب کی نوعیت تو بجائے خود ایک حقیقت ہے، خواہ ہم اس کی تحقیق کریں یا نہ کریں چنانچہ ہمارا ذہن اس سوال کا کہ "ادب کس قسم کی حقیقت ہے" جو جواب دیتا ہے، وہی ادب کے اصول ہیں۔

ایسی تحقیق کو "نظریۂ ادب" کہیں گے۔ کیونکہ اس میں مخصوص ادب پاروں کے مخصوص اوصاف کی طرف محض مثالاً اشارہ کیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف دوسری قسم تحقیق کی وہ ہے جو مخصوص ادب پاروں کے مخصوص اوصاف کو سامنے رکھ کر بحث کرتی ہے اور اس کو معمولاً انتقاد کہتے ہیں اس موقع پر ادبِ خاص کے متعلق دیکھنا ہوتا ہے کہ وہ کونسے وصف ہیں جو کسی تصنیف میں مخصوص انفرادیت پیدا کر دیتے ہیں اور آیا یہ اوصاف اچھے ہیں یا برے اسی طرح طرزِ ادا، اندازِ بیان، روحِ معانی اور کسوتِ الفاظ وغیرہ سب اس میں شامل ہیں۔

صحیح طور پر دیکھا جائے تو نظریۂ ادب کا تعلق فلسفے کے اُس شعبے سے ہے جس کو جمالیات کہتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی تحقیق کی ان دو قسموں کو الگ الگ رکھنا مشکل ہے، بلکہ ان دونوں کے مابین کوئی خطِ فاصل بھی نہیں کھینچا جا سکتا۔ نظریۂ ادب کی تحقیق ادب من حیث نفس الامر کی تحقیق سے برابر آمیز ہوتی رہے گی۔ یعنی "نظریہ ادب" حقیقی ادب کے نمونے برابر پیش کرتا رہیگا، اور یہ مثالیں اپنے ادبی اوصاف کے مطابق مہر بھی ثابت ہوں گی۔ تاریخ نقد زیادہ تر قواعد وضع کرنے کی کوشش کی تاریخ ہے جس میں زیادہ تر ایک ہی قسم کی متعدد تصانیف کے حسن و قبیح، اور ان تصانیف کے وجود میں آنے کے ذرایع کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ لیکن ایک ہی قسم کے ادب کی مخصوص مثالیں لیکر قواعد مرتب کر دینے سے کام نہیں چلتا، کیونکہ ایسے قواعد بار ہا ناقص ثابت ہو چکے ہیں۔ اور جب اُن مثالوں کی زیادہ جستجو کی گئی تو وہ قواعد شکست ہو گئے۔ بنا بران، قواعد کو جتنا چاہے وسیع کر دیا جائے لیکن وہ اسوقت تک جامع اور مانع قواعد نہیں ہو سکیں گے جب تک کہ قابل قدر (Meritorious) اوصاف (Qualities) کا مقابلہ کر کے نظریۂ ادب کے ذہنی اُصول سے وضع نہ کر لئے جائیں۔ کیونکہ بغیر اس کے یقین کرنا مشکل ہے کہ ادب کے کونسے اوصاف ادب کے لئے ناگزیر ہیں۔

اس طرح اس دوگونہ عقلی تحقیق میں جن کو ہم نے "نظریۂ ادب" اور "نقدِ محض" کا نام دیا، خلط مبحث ہونا لازمی سا ہے، اور تحقیقیں مخلوط ہوئے بغیر مکمل نہیں ہوتیں، اگر ہم انتقاد کو حسن و قبح کی تشخیص ہی تک محدود کر دیں تو اس خلط مبحث سے تحفظ ممکن نہیں جب تک اسکا تجزیہ ذہنی اُصول سے متعلق نہ ہو۔ بنا بریں ہمارے مقصد کے لئے یہی درست ہوگا کہ "نظریۂ ادب" کو تنقید ہی کے عنوان کے تحت رکھا جائے ــــ اپنی بحث کی ابتدا ہم ان چند تصنیفات کے حوالے سے کرنا چاہتے ہیں جنکو تاریخ انتقاد میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور اسکا لحاظ کریں گے کہ ان تصانیف کی غایت "نظریۂ ادب" تھی یا "نقدِ محض"۔ سب سے پہلے ہم ارسطو کی "شعریات" کو لیں گے جو تمام "منظم نظریاتِ ادب" میں سب سے زیادہ بلند و مشہور چیز ہے اس پر بحث کرنے سے ہمارا مقصود یہ نہ ہوگا کہ وہ مقالہ اُس ثقافت کا ایک نمونہ پیش کرتا ہے، جس میں اس کا نشو و نما ہوا، بلکہ اس پر ہم اس لئے بحث کرنا چاہتے ہیں کہ اس نے دوسری تمام تہذیبوں اور تمدنوں کو کیا حصہ ملا ہے اس مقالہ میں ارسطو نے تقریباً ان تمام مسائل سے بحث کی ہے جن کا سمجھنا انتقاد کو خلط مبحث سے بچانے کے لئے ضروری ہے۔ لیکن مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ادب کے عقلی جایزے (Rational Examination) پر ایک عام نظر ڈال لی جائے۔

(باقی)

ل - احمد اکبر آبادی

مکتوبات نیاز

جانِ نیاز ۔ جو کچھ تم کہتے ہو بالکل درست ہے، اس لئے نہیں کہ تمہاری ہر بات پر "بجا" کہدینا میری خو ہے بلکہ اس بنا، پر کہ چڑھتے ہوئے دھارے اور خس و خاشاک کا مقابلہ ہی کیا تاہم اگر تم یہ چاہو کہ "نقطۂ نظر" کا اختلاف دنیا سے مٹ جائے سو یہ ممکن نہیں۔ سیلاب کا جوش و خروش کشتیوں کو ڈبوتا ہی رہے گا اور کشتیاں اس میں ڈوبتی ہی رہیں گی

فلاطون کی "خم نشینی" دنیائے علم و فلسفہ کا نہایت اہم واقعہ ہے لیکن ایک شاعر کا توہین آمیز لب و لہجہ ملاحظہ کیجئے، کہتا ہے :-

بہ خم نشست فلاطوں ز شرم آب نہ شد
بہ حیرتم کہ فلاطوں شد و شراب نہ شد

کجا فلاطوں ہو جانا" اور کجا "شراب بن جانا"، لیکن خم کا ذکر ہو اور ایک رند بادہ خوار کو شراب کا خیال نہ آئے، محال ہے خم میں بیٹھکر فلاطوں کو یہ ناز کہ وہ "فلاطوں" بن گیا، شاعر کہتا ہے اسے شرم آنی چاہئے کہ خم میں بیٹھکر فلاطوں تو ہو گیا لیکن "شراب" نہ بن سکا ـــــ یقیناً بہت مضحکہ خیز خیال ہے، لیکن اس اعتماد و وثوق کو دیکھو جس نے شاعر سے یہ شعر لکھوایا۔ بہر حال میں تم سے متفق تو نہیں ہو سکتا لیکن تمہاری مخالفت کر کے اپنی جان کو عذاب میں مبتلا کرنا بھی مجھے گوارا نہیں۔ اس لئے سوائے "درست و بجا" کہنے کے میں اور کیا کہہ سکتا ہوں

تمہاری دنیا "تمہارا تیاب" ہے اور میری دنیا وہ جو شباب کھونے کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ تم اُس دور سے گزر رہے ہو جس میں صرف حال ہی حال ہے، میں اُس منزل میں ہوں جہاں یادِ ماضی کے سوا اور کچھ نہیں، یعنی جو چیز تمہاری "کارگاہ" ہے وہ میرا "تخیل کدہ" ہے، تم زندہ ہو اور میں صرف زندگی کا خواب دیکھ رہا ہوں مجھے تو یونہی سرگرداں رہنے دو۔ تمہاری کامیابیوں سے خوش ہوتا ہوں اور ان کے قیام و دوام کا متمنی ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔ میں اگر عملاً تمہارا شریک نہیں تو نہ ہوں، بلا سے، اگر اُصولاً میں تم سے متفق نہیں تو تمھیں اسکی خلش کیوں ہو۔ خار زار سے دامن کشاں گزر جانے کا سلیقہ جن کو حاصل ہے، وہ کیوں کانٹوں میں اُلجھیں۔

حضرت ۔ میں قیامت تک ماننے کے لئے طیار نہیں کہ آپ کوشش کریں اور ناکامیاب رہیں۔ صاف صاف یوں کیوں نہیں کہدیتے کہ مجھے کیا غرض پڑی ہے پرائے پھٹے میں پاؤں ڈالوں۔ دنیا کے اُصول کے مطابق یقیناً یہ عذر ایسا نہیں جس کے خلاف کوئی شخص زبان کھول سکے، لیکن میں اپنے دل کو کیونکر سمجھاؤں جو آپ کی طرف سے کسی قسم کی بے اعتنائی کا یقین کرنے کے لئے طیار ہی نہیں ہوتا۔

میں کہتا ہوں آپ نے ٹالدیا دل کہتا ہے کہ یہ ممکن نہیں۔ میں پوچھتا ہوں حصولِ مقصود میں پھر اتنی دیر کیوں ہے، وہ کہتا ہے، قسمت!

میں کیا دنیا میں کسی کے لئے بھی "مایوسی" کوئی نئی چیز نہیں، لیکن آپ کی طرف سے مایوسی یقیناً میرے لئے بالکل نئی چیز ہے اور نہیں کہہ سکتا کہ اس کا عادی ہونے کے لئے مجھے اور کتنی تمنائیں آپ سے وابستہ کرنا پڑیں گی۔ بہرحال ایک بار پھر عرض کرتا ہوں کہ

دستے بہ دستگیری من زآستیں برآر

اور نتیجہ کا منتظر ہوں۔

مصدرِ لطف و کرم ۔ عطوفت نامہ پہونچا، آنکھوں سے لگایا۔ اللہ اللہ، ایک زمانہ تھا جب ہر وقت کی حضوری حاصل تھی اور کامرانی کا یہ عالم تھا کہ ۔۔۔ جسوقت آنکھ کھُل گئی دیدار ہوگیا ——— یا اب یہ دورِ محرومی کہ مہینوں گزر جائیں اور آپ یہ بھی نہ پوچھیں۔

سعدیا بر تو چہ رنج ست کہ بگداختۂ

آپ پوچھتے ہیں کہ حال کیسا ہے شاعرانہ جواب تو صرف یہی ہوسکتا ہے کہ "پوچھنا اب ہمارے حال کا کیا" لیکن حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی محرومیوں سے جی تنگ آگیا ہے اور

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
ہمنے اپنے جی میں ٹھانی اور ہے

کہا جاتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز میں تدریج ہے، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ شباب و شیب کے درمیان کوئی ایسی منزل نہیں جہاں انسان ایک لمحہ کے لئے بھی ٹھہر کر یہ غور کرسکے کہ کیا چیز ہاتھ سے جارہی ہے اور کیوں۔

اکبر الہ آبادی کہتا ہے :۔

دنیا کی کیا حقیقت اور ہم سے کیا تعلق
وہ کیا ہے اک جھلک ہے ہم کیا ہیں اک نظر ہیں

اس شعر کی حقیقت اب سمجھ میں آئی ہے۔ ہر چند دنیا کو اک "جھلک" کہنا صرف اپنی مختصر "فرصت نگاہ" کے لحاظ سے ہے نہ کہ از روئے حقیقت، تاہم وہ چیز جو اپنا حصہ نہیں، کسی کا بھی نہیں۔

بہر حال اب یہ دور بھی ختم ہو رہا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ پلکیں کب ایک دوسرے سے مل جائیں، آپ کو دیکھنے کی آرزو تو خیر اب کیا پوری ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ غنیمت ہے اگر کبھی کبھی اس آرزو کے اظہار ہی کی فرصت نصیب ہو جائے۔

ستو جی ۔ جس وقت میری طبیعت کھلنڈرے پن کی طرف مایل ہو، اسوقت مجھ سے سنجیدہ باتیں نہ کیا کرو۔ بھلا ایسے زمانہ میں جبکہ خدا کی شانِ عفو و کریمی پر اعتماد کرنے اور اس کے بھلا دینے کو جی چاہتا ہو، ایسی باتیں کرنا کہاں تک مناسب ہیں۔

تم کہ لڑکپن میں ایک طرف حجام تمھاری سر خراشی کیا کرتے تھے اور دوسری طرف مولوی تمھاری دماغ خراشی کیا سمجھ سکتے ہو کہ خدا اگر ہے تو وہ منطقی حدود سے بالاتر ہے۔

تمھاری سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آسکتی کہ خدا کو سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے اور اگر ہے تو اس کے لئے نہ فلسفہ چھاننے کی ضرورت ہے نہ الٰہیات کی کتابوں کی۔ مختلف حالتوں میں، مختلف کیفیات کے تحت مختلف دلایل اس کے پیش کئے جا سکتے ہیں، مثلاً آجکل تم مجھ سے پوچھو تو میں بلا تامل کہدوں گا کہ خدا کے وجود کی اس سے زیادہ مستحکم دلیل اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس نے عورت پیدا کی، شراب پیدا کی اور ماش کی دال ـــــ مگر میں جانتا ہوں کہ یہ بات تمھاری سمجھ میں نہ آئے گی۔ اچھا یہ موسم گزر جانے دو، یہ کالے کالے بادل ختم ہونے دو، اس کے بعد غور کرونگا کہ خدا کس صورت میں میرے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے۔

صدیقی ۔ ابھی ابھی مکرمت نامہ ملا۔ پڑھکر سخت حیرت ہوئی۔ میں کبھی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ ـــ کی طرف سے اس قسم کی شکایت آپ کو پیدا ہو سکتی ہے۔ نہ اس لحاظ سے کہ ان پر آپ کے احسانات ایسے معمولی نہیں کہ وہ کبھی سر اٹھا سکیں، بلکہ اس خیال سے بھی کہ آپ سے منحرف ہو کر وہ سوائے نقصان کے کوئی فایدہ نہیں اٹھا سکتے

آپ نے جس محبت و دلسوزی سے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، وہ آپ کے اخلاق کی بلندی کی ایسی زبردست مثال ہے کہ وہ محسن کش تو خیر کیا لیکن میں شرم سے آب آب ہوا جاتا ہوں۔ آپ ہی بتایئے میں کیا کروں۔ نامناسب نہ ہو تو مجھے اجازت دیجئے کہ اُن حضرت سے مل کر پوچھوں کہ یہ آخر اُن کو سوجھی کیا تھی۔ اور جو کچھ وہ کہیں اسے آپ کو مطلع کر دوں۔

ہر چند میں جانتا ہوں کہ وہ کوئی معقول بات نہ کہہ سکیں گے اور بُرائی کے لئے کوئی معقول توجیہ ہو بھی کیا سکتی ہے تاہم اس سے یہ فایدہ ضرور ہوگا کہ مجھے ملامت کرنے کا موقعہ مل جائے گا اور یہ الجھن کچھ کم ہو جائے گی۔

فتنۂ دوراں ، خطا لا۔ ہر چند میں جانتا ہوں کہ تم یہاں کس بُری نیت سے آرہے ہو لیکن یہ بھی جی نہیں چاہتا کہ تمھیں آنے سے باز رکھوں۔ بہر حال آؤ اور آفتیں ڈھاؤ۔

گرچہ می دانم نگاہت فتنہ است اما مخواب

مگر یہ تو بتاؤ کہ "پیر و مرشد" کا ذکر اس قدر مایوسی کے ساتھ کیوں کیا گیا۔ تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ہمارے میکدہ کا سب سے پرانا "مُغ" ہے، اور شراب جتنی پُرانی ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ "رسا" ہو جاتی ہے۔ اور پھر یہاں تو ابھی معاملہ "فرو ریزد پر و بال" کا بھی نہیں ہے۔ جس وقت وہ داڑھی صاف کرکے، بالوں میں خضاب لگاکر، مونچھوں کو کاسمٹک سے نوکیلا بنا کر بیٹھتے ہیں، اسوقت دیکھو کیا عالم ہوتا ہے۔ وہی دلکشی و رعنائی، وہی ولولہ و برنائی! وہی دہکتا ہوا شباب وہی ٹپکتا ہوا شہاب!

میں نے اُن سے اچھی طرح تمھاری غیبت کر دی ہے۔ اس لئے پوری طیاری کرکے آنا مقابلہ ہوش کھو دینے کا ہوگا، ہوش میں رہنے کا نہیں۔

کرم گستر ا - آج سے ایک ہفتہ قبل الہ آباد کی ایک تحریر سے (یہ نہ پوچھئے کہ تحریر کس کی تھی) مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میر صاحب ہجرت کرکے کہیں جا رہے ہیں اور آپ بھی رسم وداع ادا کرنے لکھنؤ تک تشریف لائیں گے۔ خوشا نصیب سرزمین لکھنؤ کہ ایسے زبردست مہاجر و "مجاہد فی الدین" کے قدم چومنے کا شرف اسے حاصل ہو، لیکن آپ جو اہتمام چاہتے ہیں وہ میرے بس کی بات نہیں۔

آپ شوق سے میرے یہاں قیام فرما سکتے ہیں، لیکن قبلہ میر صاحب کی مہمانداری ان کے شایانِ شان مجھ سے ممکن نہیں۔ ان کے زہد و تقدس کا مجھے اعتراف ہے، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ بہت کھلے ڈلے انسان ہیں لیکن یہ رات بھر کی موجی میری برداشت سے باہر ہے۔ علاوہ اس کے ایک بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ آجکل میرے ایک دوست میرے ہی مکان پر رہتے ہیں اور بہت صبح اٹھکر ریاض کرتے ہیں، ممکن ہے میر صاحب کی شب بیداریوں میں انکی موسیقی حایل نہ ہو، لیکن ہو سکتا ہے کہ ان کے گانے میں کوئی حرج واقع ہو اور یہ مجھے کبھی گوارا نہ ہوگا۔

معاف فرمائیے، میں نے صاف صاف اس لئے لکھدیا کہ آیندہ کوئی بدمزگی کی صورت پیدا نہ ہو اور آپ مجھے ترک دوستی کی دھمکی دینے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میں کسی اور مکان کا انتظام کر دوں اور انکے دوران قیام میں جتنے مصارف ہوں ان کا بار میں برداشت کروں۔ اگر یہ نامناسب نہ ہو (اور نامناسب ہونے کی کوئی وجہ نہیں) تو براہِ کرم مجھے فوراً مطلع فرمائیے تاکہ میں مکان حاصل کرکے اس میں ضروری سامان پہونچا دوں۔

باب الاستفسار

کیا شریعتِ اسلامی میں تغیر و تبدّل ممکن نہیں؟

(جناب سید اصغر حسین صاحب - رانچی)

آپ کی تحریروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اسلامی میں آپ تغیر و تبدل ضروری سمجھتے ہیں، درانحالیکہ اگر اس اصول کو صحیح مان لیا جائے تو پھر اسلام کی کوئی متعین صورت باقی نہیں رہ سکتی اور وہ ایک بدلتے رہنے والے مذہب کی شکل اختیار کر لیگا، براہِ کرم اس مسئلہ پر ذرا وضاحت سے نظر ڈالئے۔ ممنون ہوں گا۔

(نگار) آپ نے استفسار کر کے ایک نہایت اہم بحث چھیڑ دی ہے کیونکہ اسی تنگ خیالی نے مسلمانوں کو اسوقت تک ترقی سے باز رکھا اور اسی غلط فہمی نے اسلام کی صورت کو مسخ بنا دیا ہے۔ کیا آپ نے کبھی اس پر غور فرمایا ہے کہ اسلام و شریعت دونوں ایک چیز ہیں یا ان کا مفہوم جداگانہ ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اگر یہ ایک ہیں تو کیوں اور مختلف ہیں تو ان دونوں میں باہم کیا تعلق ہے۔

آپ جس چیز کو لفظ شریعت سے تعبیر کرتے ہیں وہ فی الحقیقت فقہ اسلامی ہے اور آپ نہیں اکثر مسلمان اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ فقہ اور مذہب اسلام دونوں ایک چیز ہیں اس لئے آیئے سب سے پہلے میں آپ کو بتاؤں کہ فقہ کی حقیقت کیا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ شریعت یا فقہ نام ہے اس مجموعۂ قوانین کا جو مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور تمدنی زندگی پر حاوی ہے اور جس کی حدود سے ان کی انفرادی یا اجتماعی زندگی کا کوئی پہلو بچا ہوا نہیں ہے۔ لیکن یہ دعویٰ کرنا کہ ہمارے اسلاف جو قوانین وضع کر گئے ہیں ان میں تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں یا یہ کہ ان سے ہٹنا مذہب اسلام سے ہٹ جانا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس زمانہ میں فقہ کے مفہوم کو جو اتنی زبردست وسعت دیدی گئی ہے وہ ابتدار عہد اسلام میں مفقود تھی۔

اگر آپ نے تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا ہے تو آپ کو یہ علم حاصل ہوگا کہ قرونِ اولیٰ میں فقہ کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور چیز بھی پائی جاتی تھی جس کا اصطلاحی نام علم تھا اور جو فقہ سے بالکل جدا حیثیت رکھتی تھی۔

علم سے مراد قرآن و تفسیر کا علم تھا اور اُن روایات کا جو رسول اللہ اور صحابہ سے منسوب کی جاتی تھیں لیکن فقہ سے (جیسا کہ اس کے لغوی معنی سے ظاہر ہے) مراد عقل و رائے کے بعد کسی نتیجہ تک پہونچنا تھا اسی لئے کبھی کبھی الفاظ فقہ اور رائے مترادف حیثیت سے استعمال کئے جاتے ہیں۔ الغرض علم اور فقہ دو بالکل علٰحدہ علٰحدہ چیزیں تھیں اور اسی بنا پر مجاہد نے (من یوتی الحکمۃ) کی تفسیر میں ظاہر کیا ہے کہ صاحبِ حکمت سے مراد وہ شخص ہے جو قرآن علم اور فقہ کا ماہر ہو۔ ہارون الرشید اپنے گورنر ہر شمہ کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ "اولوالفقہ فی الدین" اور "اولوالعلم بکتاب اللہ" سے مشورہ کرتا رہے۔ الغرض عالم اور فقیہ دو بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اور اسی بنا پر ابن عمر کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ جید الحدیث تھے لیکن "جید الفقہ" نہ تھے اور ابن عباس افقہ و اعلم دونوں سمجھے جاتے تھے۔ بالفاظ دیگر گویا یوں سمجھئے کہ عالم وہ شخص کہلاتا تھا جسے صرف قرآن اور روایات کا علم ہو اور فقیہ وہ کہلاتا تھا جو جدید مسایل میں غور و فکر کے بعد خود اپنی رائے سے کام لیکر کوئی فیصلہ کرے۔

جب اسلام بالکل ابتدائی دور سے گزر کر ارتقار کی دوسری منزل میں آیا اور فتوحات کی وسعت کے ساتھ اسے غیر قوموں کے تمدن اور نئے نئے مسایل سے واسطہ پڑا تو بہت سی باتیں ایسی نظر آئیں جن کا ذکر نہ کلام مجید میں تھا نہ رسول اللہ کے اقوال میں، اس لئے جن علماء کو عدل و قضاءت کی خدمت سپرد کی گئی تھی وہ اپنی عقل و رائے سے کام لیتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو علم و رائے دونوں مل جائیں۔ اسی کا نام "تفقہ فی الدین" تھا اور جو اس میں سب سے زیادہ کامیاب ہوتا تھا اسی کو سب سے بڑا فقیہ سمجھا جاتا تھا۔ الغرض شریعت اسلامی میں جو مرتبہ علم قران و حدیث کا تھا وہی بلکہ اس سے زیادہ رائے کا تھا کیونکہ بغیر اس کے کام چلنا دشوار ہو جاتا۔ ایک بار امیر معاویہ نے جناب زید بن ثابت سے کسی امر میں قانونی مشورہ کیا لیکن "فلم یوجد عندہ او عندہم فیہا علم"۔ (نہ وہ کوئی روایت پیش کر سکے نہ دیگر حضرات) آخر کار امیر معاویہ نے اپنی ذاتی رائے سے فیصلہ کیا۔ ایک بار مصر کے قاضی نے خلیفہ عثمانی سے کسی معاملہ کے متعلق دریافت کیا۔ آپ نے جواب دیا کہ مجھ تک اس باب میں کوئی روایت نہیں پہونچی اس لئے خود اپنی رائے سے کام لیکر فیصلہ کر دو۔

بنو امیہ کے زمانہ تک باقاعدہ تنظیم شریعت نہ ہو سکی تھی، لیکن بنو عباس کے دور میں البتہ باضابطہ قانونسازی کی ابتدا ہوئی اور اس کے چار اصول مقرر کئے گئے:۔ قرآن۔ سنت۔ قیاس اور اجماع۔ چنانچہ ان اصول پر

فقہ اہل السنت کی جو کتاب سب سے پہلے مرتب کی گئی وہ مالک بن انس کی مُوطا ہے۔ اسوقت علاوہ مدینہ کے شام، عراق اور ہسپانیہ میں بھی مختلف حضرات اپنی اپنی فقہ مرتب کر رہے تھے لیکن سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت مُوطا ہی کو حاصل ہوئی۔ اس کے بعد عراق کی رائج کردہ فقہ کو حماد بن ابی سلیمان نے سنبھالا اور پھر ابو حنیفہ نے اس کو چار چاند لگا دئے اور بعد کو ان کے دو شاگرد ابو یوسف اور محمد کی خدمات تدوین شریعت میں بہت مقبول ہوئیں اور انھیں کی مرتب کردہ فقہ پر آج کل اہل سنت عمل کر رہے ہیں۔

یہ تھا نہایت مختصر سا بیان تدوین فقہ کی تاریخ کا لیکن اس کے ساتھ آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ مسایل شریعت میں تمام مسلم جماعتوں کا اتفاق کبھی نہیں ہوا اور ٹھیک اسی وقت جبکہ قیاس و رائے سے کام لیکر قوانین و قواعد مرتب ہو رہے تھے ایک جماعت ایسی بھی تھی جو اس کی سخت مخالف تھی اور وہ کہتی تھی کہ قرآن و حدیث میں کیا چیز نہیں ہے کہ ہم کو قیاس و رائے سے کام لینا پڑے۔ بعد کو یہ اختلاف برابر بڑھتا ہی گیا اور کبھی کوئی ایسی شریعت قایم نہ ہو سکی جسپر تمام سنیوں نے بھی اتفاق کیا ہو، چہ جائیکہ شیعہ اور خوارج وغیرہ کو اگر ان کو بھی لے لیا جائے تو پھر اختلاف کی کوئی انتہا نہیں رہتی

اس بیان سے دو باتیں واضح ہو گئیں ایک یہ کہ جس چیز کو شریعت اسلامی سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ کوئی منصوص چیز نہیں ہے، یعنی نہ خدا کی نازل کی ہوئی چیز ہے اور نہ رسول اللہ کی بنائی ہوئی اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں میں کبھی کوئی ایسی شریعت نہیں پائی گئی جس پر بالاتفاق سب کا عملدرآمد رہا ہو۔ اب اس حقیقت کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ آپ کا یہ دعویٰ کرنا کہ شریعت یا فقہ میں تغیر و تبدل کو راہ دینا اسلام کو خراب کرنا ہے کس حد تک درست ہو سکتا ہے۔

اس بحث میں آپ لوگ اس حقیقت کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں کہ دین و مذہب دو علحدہ علحدہ چیزیں ہیں۔ دین سے مراد وہ اُصول عقاید ہیں جو تمام افراد میں جزو مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا مثلاً یہ کہ خدا ایک ہے اور محمد اسکے رسول ہیں، لیکن اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ مذہب ہے اور اس میں اگر اختلاف بھی ہو تو اس کا اثر "وحدت فی الدین" پر نہیں پڑتا۔ اور اسی بنا پر ایک زمانہ سے یہ کہتا چلا آرہا ہوں کہ شیعہ سنی کے جھگڑے دین سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اور ان کا تعلق ان مسایل سے ہے جو ہماری دینی مرکزیت یا اسلامی اشتراک پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

مذہب جس میں ہمارے سیاسی، معاشرتی اور تمدنی قوانین سب شامل ہیں کبھی متفق علیہ چیز نہیں ہو سکتا اور نہ ایک جگہ قایم رہنے والی چیز ہے۔ کیونکہ زمانہ کے ساتھ ساتھ ہمارے تمدن، ہماری معاشرت، ہمارے عادات و اطوار اور ہماری ضروریات میں تغیر ہونا ضروری ہے اور تہذیب یا کلچر کے اس تغیر کے ساتھ ہمارے اجتماعی نظام کا بدلنا بھی لازم ہے۔ چنانچہ آپ دیکھئے کہ آج خود ہمارے علماء کرام کی تہذیب و معاشرت کیا ہے۔ کیا یہ بالکل وہی ہے جو عہد رسالت و خلافت میں پائی جاتی تھی۔ اگر نہیں ہے تو آپ ان سے بھی کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے شریعت کی پابندی نہیں کی کیونکہ

قانون اسلامی میں ہمارے لباس وغیرہ کے مسایل بھی شامل ہیں۔

اس سے تو آپ کو انکار نہ ہوگا کہ علوم وفنون کی ترقی نے اسوقت زمان ومکان دونوں کے مفہوم کو بدلدیا ہے اور تجارت نے ہر ملک وقوم کو ایک دوسرے سے وابستہ کردیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ زندگی کے مشاغل بہت وسیع ہوگئے ہیں اور ایسے ایسے مسایل ہمارے سامنے آگئے ہیں، جن کا اب سے قبل وجود تو خیر کیا، وہم وگمان بھی نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ جب رسول اللہ کے بعد ہی معاشرت کی گتھیاں سلجھانے میں لوگوں کو قرآن واحادیث سے ہٹ کر قیاس ورائے سے کام لینے کی ضرورت پڑی تو اب کہ زمانہ اتنی ترقی کرچکا ہے اور ہزاروں نئی باتیں پیدا ہوگئی ہیں، ہم قیاس ورائے سے کیونکر قطع نظر کرسکتے ہیں اور وہ شریعت جو اب سے صدیوں سال قبل مرتب ہوئی تھی وہ ہماری موجودہ زندگی میں کیا کارآمد ثابت ہوسکتی ہے ــــ قانون ہمیشہ اقوام کی زندگی کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے اور اگر کسی مذہب میں اتنا لوچ نہیں ہے کہ وہ ضروریات ملک وملت کے لحاظ سے اپنے اندر تبدیلی پیدا کرسکے تو وہ قطعاً بے روح مذہب ہے اور زیادہ عرصہ تک قایم نہیں رہسکتا ــــ اگر میں یہ کہتا ہوں کہ شریعت میں تبدیلی کی ضرورت ہے تو کوئی نئی بات نہیں کہتا بلکہ اسی مطالبہ کا اعادہ کرتا ہوں جو قرون اولیٰ میں اکابر دین کی طرف سے کیا گیا تھا اور جس کا نتیجہ آپ کی موجودہ شریعت ہے۔

ظاہر ہے کہ سرزمین عرب میں جو قوانین مرتب کئے گئے تھے ان میں وہیں کی آبادی اور اس زمانہ کے مقامی ماحول کو پیش نظر رکھا گیا ہوگا کیونکہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آج چین میں بیٹھکر لندن کے لئے قانون وضع کیا جائے اور لندن میں بیٹھکر چین کا۔ یا یہ کہ اسوقت ہم کوئی ایسی شریعت مرتب کردیں جو ہزار سال بعد بھی کام دیسکے۔ پھر کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ جسوقت فقہ حنفی تیار ہوئی ہے اسوقت اہل عرب کو اس کا علم حاصل تھا کہ ایک وقت ہندوستان میں بھی اسلام پھیلے گا اور ان کو اپنے ملکی ضروریات کے لحاظ سے فلاں فلاں امور میں رشاد وہدایت کی ضرورت لاحق ہوگی۔ یقیناً نہیں۔ پھر آپ کیونکر اس کا دعویٰ کرسکتے ہیں کہ شریعت اسلامی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بھی اتنی ہی مفید وکارآمد ثابت ہوسکتی ہے جتنی اب سے سیکڑوں سال قبل عرب کے باشندوں کے لئے تھی، اور اس میں اب کسی تغیر وتبدل کی گنجایش نہیں ــــ اس سلسلہ میں ایک بات البتہ قابل غور ہے (اور وہ بھی ان لوگوں کے لئے جو بہت زیادہ قدامت پرست ہیں) وہ یہ کہ فقہ اسلامی میں بعض مسایل ایسے ہیں جو کی صراحت قرآن مجید میں موجود ہیں، بعض احادیث سے لئے گئے ہیں اور بعض قیاس ورائے سے کام لیکر اجتہاد کئے گئے ہیں۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ قرآن مجید میں جو مسایل مذکور ہیں ان کو جوں کا توں رہنے دیا جائے اور وہ ایسے ہیں بھی نہیں جن میں تغیر کی ضرورت زیادہ محسوس کی جائے، لیکن احادیث وقیاس کے رد سے جو حصہ فقہ اسلامی کا مرتب ہوا ہے اس کو بدلا جاسکتا ہے اگر اسکی ضرورت محسوس ہو۔ ایسا کرنے سے اصل دین کو کوئی صدمہ نہیں پہونچ سکتا کیونکہ قرون اولیٰ میں بھی برابر اسی اصول پر عملدرآمد رہا ہے اور اس کو سامنے رکھے بغیر شریعت اسلامی ہر زمانہ وہر ملک کے ضروریات کا ساتھ نہیں دیسکتی۔ رہا یہ اعتراض کہ اب سے ایک ہزار سال قبل کا انسان تو اجتہاد سے کام لے سکتا تھا اور اب اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ سو اسکے جواب میں بجز اس کے اور کیا کرسکتا ہوں کہ معترض کے سامنے بیل گاڑی اور ہوائی جہاز دونوں کو پیش کرکے خاموش ہوجاؤں ــــ

مطبوعات موصولہ

نغمات مجموعہ ہے جناب لطیف اکبرآبادی کے ان چھوٹے چھوٹے "منثورات" کا جو باوجود بحر و قافیہ کی پابندی نہ رکھنے کے کسی طرح "شعر" سے کم نہیں۔

اُردو ادب میں اس نوع کے انداز تحریر کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے جب ٹگور کی گیتان جلی نوبل پرائز کی مستحق سمجھی گئی اور اس کے ترجمے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں شایع ہوئے۔ لیکن ہمارے نوجوان انشاپردازوں نے اس رنگ کے انشاء کی جتنی مٹی پلید کی اس کا اندازہ یوں ہوسکتا ہے کہ ہر وہ طالب علم جو چند غیر مربوط الفاظ یکجا کرسکتا تھا وہ "ٹگور" کا مدمقابل بن گیا۔

اس طرزِ تحریر کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی معنویت ہے اور اسی کے ساتھ انداز بیان کی وہ لطافت جو مفہوم کی نزاکت کو نمایاں کرنے کے لئے وہی حیثیت اختیار کرسکے جو نقش میں "پس منظر" کو حاصل ہوتی ہے۔ اور اس خصوصیت کے لحاظ سے جناب لطیف کا یہ مجموعہ اس نوع کے لٹریچر میں نمایاں مرتبہ رکھتا ہے۔

لطیف افسانہ نگار کی حیثیت سے ملک میں خاص امتیاز رکھتے ہیں اور ان کی اس فطری اہلیت کا علم ملک کو اب سے تقریباً سولہ سال قبل اس وقت ہوگیا تھا جب سب سے پہلے نگار میں ان کے افکار لطیف شایع ہوا کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ عرصہ تک تجارتی مشاغل میں مصروف رہنے کی وجہ سے خاموش رہے، لیکن اب گزشتہ چند سال سے وہ پھر ادبی برادری میں شامل ہوگئے ہیں اور غالباً زیادہ زور و طنطنہ کے ساتھ۔

جن حضرات نے "لالہ رُخ" اور "ادبِ لطیف" (ان کے افسانوں کا مجموعہ) دیکھا ہے وہ بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں کہ "نغمات" جس میں "لطیف" کی پاکیزہ خیالی کی بہترین مثالیں یکجا کردی گئی ہیں کیا چیز ہوگا۔

یہ مجموعہ مجلد شایع ہوا ہے اور علاوہ محصول ۱۲ر میں کنول بک ڈپو آگرہ سے مل سکتا ہے۔

پستالوزی یہ کتاب مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی نے شایع کی ہے، اور اس کی اہمیت ثابت کرنے کے لئے غالباً اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس میں پستالوزی کے فلسفۂ تمدن و تعلیم سے بحث کی گئی ہے۔

پستالوزی یوروپ کی وہ زبردست ہستی تھی جو موجودہ تمدن و تعلیم کی رفتار میں اولین "میل راہ" کی حیثیت

رکھتی ہے وہ ہر چند سوئٹزرلینڈ کا رہنے والا تھا، لیکن یوروپ کا کوئی ملک ایسا نہیں جس نے اٹھارویں صدی کے آخر اور اُنیسویں صدی کی ابتدا میں اس کے فلسفۂ تعلیم و تمدن سے فایدہ نہ اُٹھایا ہو اور خصوصیت کے ساتھ جرمنی کا موجودہ ذہنی معیار تو یکسر اسی کی تعلیم کا ممنون احسان ہے۔

یہ کتاب علاوہ مقدمہ کے چار ابواب پر مشتمل ہے جن میں پستالوزی کی زندگی، اور اس کے فلسفۂ تمدن و تعلیم سے نہایت فاضلانہ بحث کی گئی ہے۔ اس کے مصنف ڈاکٹر عبدالحمید زبیری ام اے، پی ایچ ڈی نے اس تصنیف کا مواد جرمنی کے دوران قیام ہی میں حاصل کیا تھا اور اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ پستالوزی کے متعلق کوئی ذریعۂ معلومات ایسا نہیں ہے جس سے انھوں نے فایدہ نہ اُٹھایا ہو۔

اخیر میں اصطلاحات علمیہ کا ترجمہ بھی دیا گیا ہے جس سے کہیں کہیں مجھے اختلاف ہے مثلاً Aesthetic کا ترجمہ تو انھوں نے جمالیات کیا ہے لیکن (Aesthetical) اور (Aesthetical sense) کا جمالی اور جمالی حس کیا ہے، حالانکہ جمالیاتی اور جمالیاتی حس ہونا چاہئے۔

Analyse کا ترجمہ تحلیل صحیح نہیں ہے، تجزیہ ہونا چاہئے۔ Epicurean کا ترجمہ اب عام طور ایپقورین کیا جاتا ہے اس لئے اب اس کے بجائے ایک نیا لفظ لذتیین پیدا کرنا (اور وہ بھی اتنا ثقیل) مناسب نہیں۔

Idealism کا ترجمہ عینیت ٹھیک نہیں، تصوریت زیادہ مناسب ہے۔

Organic کا ترجمہ نامی کیا گیا ہے، حالانکہ عضوی ہونا چاہئے۔

یہ اور اسی قسم کے بعض اصطلاحات ایسی ہیں، جن پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ یہ کتاب مجلد شایع ہوئی ہے اور یہ ہیں مکتبۂ جامعہ دہلی سے ملسکتی ہے۔

معاہدۂ عمرانی روسو کی کتاب Social Contract دنیا کی ان چند کتابوں میں سے ہے جو عہد حاضر میں سیاست مدن اور قانون سازی کی اولین بنیاد سمجھی جاتی ہیں۔ غالباً روئے زمین کی کوئی مہذب زبان ایسی نہیں ہے جس میں اس کا ترجمہ نہ ہوا ہو اور سیاسی مفکرین نے اس کا مطالعہ نہ کیا ہو۔

ابتدائی معاشری اداروں سے لیکر ایک انتہائی ترقی یافتہ حکومت تک پہونچنے میں جن جن مدارج سے ایک قوم کو گزرنا پڑتا ہے اور جن جن مسایل پر توجہ کرنا اس کے لئے ناگزیر ہوتا ہے ان سب سے اس کتاب میں بحث کی گئی ہے اور ان کا کوئی پہلو ترک نہیں کیا گیا۔

وہ حضرات جو انسان کی تمدنی ترقی اور سیاسیات عالم سے ماہرانہ دلچسپی حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کیلئے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔

ڈاکٹر محمود حسین خاں ام۔ اے پی ایچ ڈی نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ بہت صاف، سلیس اور شگفتہ ہے۔ متعدد مفید حواشی کا بھی اس میں اضافہ کیا گیا ہے اور اصطلاحات کی فہرست بھی اخیر میں شامل کر دی گئی ہے دو روپیہ میں مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

فکر و نشاط مجموعہ ہے جناب جوشؔ ملیح آبادی کی ۸۲ نظموں کا جو مختلف جرائد و رسائل میں شایع ہو کر بہت مقبول و مشہور ہو چکی ہیں۔ جوشؔ اسوقت کے ان چند شاعروں میں سے ہیں جن کی مخصوص انفرادیت سے انکار ممکن نہیں اور جو مفہوم و معنی کی جستجو کے ساتھ ساتھ حسنِ ادا اور ندرتِ بیان کی خصوصیات کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ لیکن اتنی بلندی پر پہونچکر ایک شاعر کو سب سے زیادہ دشواری یہی ہوتی ہے کہ اپنے احساسات کے لحاظ سے بعض اوقات اسے مناسب الفاظ میسر نہیں آتے اور کبھی کبھی وہ اپنی کیفیات سے خود اتنا مغلوب ہو جاتا ہے کہ شعر کی ظاہری ترکیب کی طرف اس کا ذہن منتقل ہی نہیں ہوتا اور وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ الفاظ سے ادا ہو گیا اور دنیا کو اُسے اس طرح سمجھنا بھی چاہیئے۔ چنانچہ اس نوع کے تسامحات جابجا جوشؔ کے کلام میں بھی نظر آتے ہیں، جن کو "خالِ رُخِ زیبا" سمجھکر اہلِ نظر کو ٹالدینا چاہیئے۔

شاعری میں سب سے زیادہ نازک و دقیق چیز "تعبیرات" کا اظہار ہے۔ کیونکہ شاعر تو اپنی جگہ اپنے غیر معمولی احساس اور اپنی بڑھی ہوئی ذہانت کے زیر اثر ہر فرضی و ذہنی کیفیت کو بھی مرئیات میں منتقل ہوتے ہوئے دیکھ لیتا ہے لیکن سننے والا چونکہ شاعر کی کیفیات سے محض انعکاسی لذت حاصل کرتا ہے اس لئے وہ یہ بھی سمجھنا چاہتا ہے کہ جو بات شاعر کہنا چاہتا ہے وہ ممکنات کے حدود میں بھی ہے یا نہیں اور اسی لئے اساتذۂ قدیم کا شمار تھا کہ وہ کبھی کوئی ایسی "ترکیب و تعبیر" پیش نہ کرتے تھے جب تک اس کا ثبوت الفاظ سے تبادر نہ ہو۔

مثلاً جوشؔ کا شعر ہے:۔

مرا دل دھڑکتا ہے یوں زیر و بم سے — جھپکتی ہے جس طرح مژگانِ دوراں

شعر نہایت پاکیزہ ہے، لیکن "مژگانِ دوراں" کیا چیز ہے، اس کو نہ آپ اس شعر سے سمجھ سکتے ہیں اور نہ قبل و بعد کے اشعار سے۔ اس نوع کے مفروضات کے لئے (جو استعارۂ محض کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی کوئی متعین صورت موجود نہیں ہوتی) ہمیشہ کسی نہ کسی ثبوت کا پایا جانا ضروری ہے اور اسی چیز کے فقدان نے اس شعر کو معیار سے گرا دیا۔ ایک اور شعر ملاحظہ ہو:۔

اک وسوسہ جو قوم ہو خود فی صدورِ ناس — اس وسوسہ میں جذبۂ ایماں ہوئے تو کیا

پہلے مصرعہ کا انداز بیان اُلجھا ہوا ہے اسے یوں ہونا چاہیئے تھا:۔ اک وسوسہ ہو قوم ہی جب فی صدورِ ناس دوسرے مصرعہ میں "جذبہ" واحد ہے اور ردیف اسم جمع چاہتی ہے۔ اگر ترکیب اضافی ہوتی تو جذبہ کو "جذبے"

کہہ سکتے ہیں لیکن "جذبۂ ایماں کی فارسی ترکیب میں اس کا بھی امکان نہیں۔

تعبیر کی بے اعتدالی کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:۔

ان بتوں کی بزم میں تو بھی ہوا ہے باریاب　　خاک کو پرچھائیاں جن کی بناتی ہیں گلاب

دوسرے مصرعہ میں گلاب خواہ عرق کی صورت میں فرض کیا جائے یا پھول کی صورت میں خاک سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، البتہ اگر زیرۂ گلاب کہا جاتا تو خاک سے تعلق پیدا ہو سکتا تھا۔

عدم توازن کی ایک مثال سنئے:۔

چاندنی میں جوئے شیریں جیسے تھم تھم کر بہے　　انکھڑیوں کی شعر گوئی، ساعدوں کے زمزمے

جس نظم کا یہ شعر ہے اس کا عنوان رقص ہے اور رقص ہی کی شاعرانہ تعبیرات اس میں ظاہر کی گئی ہیں۔ دوسرا مصرعہ پہلے سے بالکل علیحدہ ہے۔ یا تو پہلے مصرعہ میں ویسے ہی دو ٹکڑے ہوتے جیسے دوسرے مصرعہ میں ہیں یا دوسرے مصرعہ کا انداز بیان بھی پہلے مصرعہ کے ہم آہنگ ہوتا۔ علاوہ اس کے "ساعدوں کے زمزمے" بھی محل نظر ہیں۔ اس شعر کا عدم توازن اس طرح دور ہو سکتا ہے:۔

چاندنی میں جوئے شیریں جیسے تھم تھم کر بہے　　انکھڑیوں سے یا کسی کے جیسے نکلیں زمزمے

الغرض اس طرح کے تسامحات جوش کے کلام میں پائے جاتے ہیں جن کو لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں اور لطفِ معانی سے متاثر ہو کر انھیں یقیناً نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ لیکن اگر خود جوش صاحب اپنے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالنے کی عادت ڈال لیں تو یہ نقص بھی دور ہو سکتا ہے۔

جوش کے فطری شاعر (اور شاعر بھی قدرِ اول کا شاعر) ہونے میں کلام نہیں اور قدرت کی طرف سے جو شیریں حلاوت ان کی زبان کو اور جو لطافت و پاکیزگی ان کے ذہن کو عطا ہوئی ہے وہ ایسی معمولی چیز نہیں جس پر غبطہ کیا جا سکے۔

اس مجموعہ کی قیمت عہ ہے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی

کائنات مختصر سا رسالہ بھی مکتبۂ جامعہ نے شایع کیا ہے۔ اس میں فلکیات کے بالکل ابتدائی مسایل سے بحث کی گئی ہے اور نظام شمسی کا مختصر سا حال نہایت صاف و سہل زبان میں بیان کیا گیا ہے تاکہ بچے بھی سمجھ سکیں۔ فلکیات ایسا موضوع ہے جس کا علم کچھ نہ کچھ ہر شخص کو حاصل ہونا چاہیئے اور اسقدر دلچسپ ہے کہ طبیعت کبھی اس کے مطالعہ سے اکتاتی ہی نہیں۔ ضرورت ہے کہ اس موضوع کو بچوں کے ابتدائی نصاب میں بھی شامل کیا جائے تاکہ شروع ہی سے وہ "تفکر و تدبر" کے عادی ہو جائیں۔ اس رسالہ کی قیمت ۵ ر ہے۔

اسلامی طب اس کتاب کا موضوع جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے مذہب اسلام سے تعلق نہیں رکھتا کہ اس میں دعا تعویذ یا جھاڑ پھونک کا ذکر ہو بلکہ اس میں نہایت تحقیق کے بعد یہ بتایا گیا ہے

کہ مسلمانوں کی حکومت میں فن طب نے کتنی ترقی کی اور شاہانِ اسلام نے اس فن کی کیا کیا خدمات انجام دیں۔
اس میں پہلے جاہلیت عرب کی حالت دکھا کر عہد بنی امیہ و بنی عباس کی طبی ترقیاں دکھائی ہیں، اسی طرح آل ساماں آل بویہ، سلاجقہ، خلجیوں، بودھیوں اور مغلوں کے زمانہ کی ترقیاں پیش کر کے دکن کی مختلف حکومتوں نے اسوقت تک جو سرپرستیاں اس فن کی کی ہیں ان کو نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔
الغرض یہ کتاب فن طب کی تاریخ کا نہایت جامع و بسیط تذکرہ ہے اور اس میں بہت ایسی نادر کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اسوقت بالکل نایاب ہیں۔ ضرورت ہے کہ یہ نسخہ ہر لائبریری میں رکھا جائے اور ہر وہ شخص اس کا مطالعہ کرے جس کو اس فن سے کچھ بھی دلچسپی ہے۔ ملک کو جناب قاضی معین الدین صاحب رہبر فاروقی کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے ایسی مفید و کار آمد کتاب پیش کی۔ اس کی قیمت عہ ہے اور ملنے کا پتہ سن برج ہاؤس عابد بلڈنگ مصطفےٰ بازار حیدر آباد دکن۔

مقالات حالی حصۂ دوم

اس کتاب کو انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن) نے شایع کیا ہے۔ اس میں مولٰنا حالی مرحوم کی تقریریں اور تبصرے یکجا کر دئے گئے ہیں۔
مولٰنا حالی ملک کے ان چند افراد میں سے تھے جو اب حقیقی معنے میں ہیرو کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور اسلئے ان کی زبان و قلم سے نکلا ہوا ہر ہر لفظ ایسی یادگار کا حکم رکھتا ہے جس کا احترام کرنا ہمارے فرایض قومی میں داخل ہے۔
اس مجموعہ میں سب سے پہلا لکچر وہ ہے جو ۱۸۷۶ء میں دہلی سوسائٹی کے جلسہ میں مولانا نے پڑھا تھا اور آخری تقریر وہ ہے جو ۱۹۰۸ء میں حکیم اجمل خاں مرحوم کے عطائے خطاب کے جلسۂ تہنیت میں مولانا نے کی تھی۔
تبصرے کے سلسلہ میں رسایل کے علاوہ جن جن کتابوں پر اظہار خیال فرمایا ہے ان میں مولانا شبلی، مولانا آزاد وغیرہ مشہور مصنفین کی کتابیں بھی شامل ہیں۔
اس کی قیمت عہ ہے اور ملنے کا پتہ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

مشاہیر ہند حصۂ اول

سید بادشاہ حسین صاحب حیدر آبادی کی تصنیف ہے جس میں آغا خاں، اقبال اکبر حیدری، بوس، ٹیگور اور جواہر لال نہرو کے مختصر حالات زندگی درج کئے گئے ہیں اور ہر ایک کی لیتھوگرافی کی تصویر بھی دیدی گئی ہے۔ مشاہیر کے حالات میں اس نوع کے مختصر رسالے، جبکہ بسیط و مفصل کتابوں کے پڑھنے کا ذوق ابھی عام نہیں ہوا ہے، بہت مفید چیز ہیں۔
بادشاہ حسین صاحب ان نوجوانانِ حیدر آباد میں سے ہیں جو تصنیف و تالیف کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں، اسلئے انھوں نے جو کچھ جس انداز میں لکھا ہے لایق تحسین ہے۔ یہ کتاب سید عبد القادر اینڈ سنس چار مینار حیدر آباد دکن سے ایک روپیہ میں حاصل ہو سکتی ہے:

سودا شیخ چاند ام۔اے، ال ال بی (عثمانیہ) مرحوم کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جو شعبۂ اُردو جامعۂ عثمانیہ کی طرف سے مرحوم نے پیش کیا تھا اس میں سودا کی زندگی اور اس کے کلام پر تحقیقی و انتقادی بحث کی گئی ہے اور یہ کہنا غالباً نادرست نہ ہوگا کہ اس نوع کے عالمانہ مقالے بہت کم لکھے جاتے ہیں اُردو ادب کا ذوق رکھنے والوں کے لئے سودا کی اس یادگار کا مطالعہ کرنا ازبس ضروری ہے۔

یہ مقالہ ٹائپ کے تقریباً ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور دو روپیہ آٹھ آنے میں انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن) سے ملسکتا ہے۔

آداب حق یہ کتاب جناب محمد ایوب صاحب باغ چشتی اکبرآبادی کے مقالات و تجربات کا مجموعہ ہے جسے انکے دو بیٹوں (محمد محمود الحق اور محمد انوار الحق صاحبان) نے مرتب کر کے شایع کیا ہے۔ اس مجموعہ میں وہی سب کچھ ہے جس کی ایک "چشتی ثم اجمیری" سے توقع کی جاسکتی ہے۔

اس میں مختلف اخلاقی نصایح درج ہیں اور علما و مشایخ کے اقوال کے علاوہ احادیث نبوی سے بھی استفاد کیا گیا ہے۔ جس حد تک اخلاقی تعلیم کا تعلق ہے موضوع کے اچھے ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن سوال یہ ہے کہ اس قسم کی اور کتابوں سے اس وقت تک کیا فایدہ حاصل ہوا ہے، کہ اس کی طرف، کوئی نئی توقع قایم کی جائے۔ مسلمانوں کو فی الحقیقت انھیں زبانی مواعظ نے تباہ کیا ہے کیونکہ جو قوت، عمل پر صرف ہونی چاہئے تھی وہ قول میں ختم ہو جاتی ہے اور اسی لئے ایسی تصانیف کی حیثیت بالکل وہی ہے جو کلام مجید کے رحل و غلاف کی کہ ان میں سے کسی چیز کا تعلق مغز و مدعا سے نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص وقت ضائع کرنے کے لئے ایک روپیہ صرف کرنا چاہے تو آزاد اینڈ کوڈگی بازار اجمیر سے کتاب طلب کرلے۔

مناسک حج تصنیف ہے جناب امیر احمد علوی بی اے کی جواب "حاجی" بھی ہوگئے ہیں۔ اس میں فاضل مصنف نے حج کے اسرار و مناسک عام فہم زبان میں لکھے ہیں اور اسی کے ساتھ وہ آسانیاں بھی بتادی ہیں جنھوں نے اس وقت سفر حجاز کو بجائے سفر کے تفریح بنا رکھا ہے۔ حج کا ارادہ رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ بہر نوع مفید ہے۔ یہ کتاب امیر محل لائبریری کاکوری (لکھنؤ) سے غالباً مفت مل سکتی ہے۔

مولویت اور اسلام مقالہ ہے جناب حاجی نبی احمد صاحب بریلوی کا جس میں خصیبانہ انداز سے مولویت کی تباہکاریوں کو ظاہر کیا گیا ہے۔ ہر چند مولوی کی نسبت بجائے خود ایک ایسی چیز ہے جیسے طاعون یا تپ دق کہ اس کے اظہار کے بعد اور کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، تاہم نبی احمد صاحب نے دلایل عقلی و نقلی سے بھی اس جماعت کی سیاہکاریوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

یہ رسالہ چار آنے میں حاجی صاحب موصوف سے بریلی کے پتہ پر مل سکتا ہے۔

شہدائے کربلا حصۂ اول

امامیہ مشن لکھنؤ کا ۸ ۴ صفحہ کا تبلیغی رسالہ ہے جس میں مولانا سید علی نقی صاحب نے ۶۳ شہدائے کربلا کا ذکر کیا ہے جن میں سب سے پہلا نام مسلم بن عوسجہ الاسدی کا ہے اور آخری حبیب ابن مظاہر اسدی کا۔ کربلا و واقعات کربلا کی تمام مروجہ تاریخوں کو دیکھنے کے بعد ہمیشہ میرے دل میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جو تفصیلات ان میں بیان کی جاتی ہیں ان کا علم لوگوں کو کیونکر حاصل ہو سکا اور واقعات رزم کی جزئیات کو اس طرح ترتیب کے ساتھ ظاہر کرنا گویا کہ وہ کوئی داستانِ بزمِ عیش ہے، کیونکر ممکن ہے — اس سے قبل بھی میں نے امامیہ مشن کے ایک رسالہ پر یہی اعتراض کیا تھا اور اب اس کے دیکھنے کے بعد بھی مجھے وہی کہنا پڑتا ہے۔

ہر چند اس رسالہ میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ کتب تاریخ ہی سے لیا گیا ہے اور اس کے اظہار میں حرج بھی نہیں لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ تاریخ کی کتابوں میں بھی جو کچھ تحریر ہے اسے صحیح بھی باور کیا جائے اور جس امر کے اظہار میں کوئی حرج نہ ہو اس پر خواہ مخواہ یقین بھی کر لیا جائے۔

یہ رسالہ ۴ ر میں دفتر امامیہ مشن لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔

شاد عظیم آبادی کے سو شعر

شاد عظیم آبادی کے ایک شاگرد جناب حمید عظیم آبادی نے یہ انتخاب شایع کیا ہے اور برا نہیں ہے۔ شاد عہد متاخرین میں اس مرتبہ کے شاعر تھے کہ ان کا مثل اسوقت نہ دہلی پیش کر سکا نہ لکھنؤ۔ اور یہ خبر غالباً مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ اب ان کا دیوان بھی حمید صاحب کی کوشش سے زیر طبع ہے — اس خیال سے کہ ممکن ہے لوگ شاد کی حقیقی عظمت کو فراموش کر چکے ہوں ان کے چند اشعار یہاں پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں:—

زمانہ چاہیے دل کو کہ حاصل ہو نیاز اس کا
بہت دیر آشنا ہے اے جبینِ شوق، ناز اس کا

وہ اور پرسشِ احوالِ ہجر، شان اسکی!
کہاں پہ آکے ادب نے زباں کو بند کیا

یہاں نہ نشو و نما کا حاصل کوئی ثمر ہے نہ رنگ و بو کا
ہنسو گے خود اس چمن پہ غنچو، زمانہ آئے ذرا نمو کا
پکار کر وحشیوں سے کہدو خزاں کا بھی دور ہے غنیمت
قبا کے دامن کو ٹانک تو لیں اگر نہ موقع ملے رفو کا

جب اہلِ ہوش سے کہتے ہیں افسانہ آپ کا
سنتا ہے اور ہنستا ہے دیوانہ آپ کا

نہ جاں بازوں کا مجمع تھا نہ مشتاقوں کا میلا تھا — خدا جانے کہاں مرتا تھا میں، جب تو اکیلا تھا

اُٹھ گئے اس مقام سے اشک بھر آئے جس جگہ — آج تلک بچائے ہیں عشق کی آبرو کو ہم،

جیسے کسی کو ہو نہیں جاتی کسی سے ضد — میں تو اب آسماں کی طرف دیکھتا نہیں

کشیدہ رکھو گے مجھ سے کبتک تم اپنی ابروئے جانستا کو — شکار کرنا تھا کر چکے بس اُتار بھی دو پر طھی کمانکو

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہی محرومی — جو بڑھکر خود اُٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

یہ انتخاب چار آنے میں حمید منزل لودی کٹڑہ سے ملسکتا ہے۔

انمول جواہرات ہرچرن لال صاحب ورمن کی تالیف ہے جس میں روحانی تعلیم کے متعلق مختلف خیالات و مقالات یکجا کردئے گئے ہیں۔ زبان صاف و سلیس ہے اور آٹھ آنے میں سرن داس صاحب پریم نگر دیال باغ آگرہ سے ملسکتی ہے۔

علامۂ سیتاپوری چھوٹی تقطیع کا دو جزو کا رسالہ ہے جس میں مولوی اکرام علی صاحب سیتاپوری کے علمی کارنامو کا ذکر کیا گیا ہے۔ اکرام علی صاحب فورٹ ولیم کے اس نورتن میں سے تھے جنھیں ڈاکٹر جان گلگرائسٹ نے اکٹھا کیا تھا۔ یعنی یہ لطف و افسوس، حیدری و حسینی وغیرہ کے ساتھیوں میں سے تھے انھوں نے اخوان الصفا کا اُردو ترجمہ کیا تھا اور کہا جاتا ہے کہ خوب کیا تھا، بعد کو یہ اجمیر چلے گئے اور صوفی بن گئے یہاں تک کہ اس رسالہ میں ان کی ولایت کے ثبوت میں ایک واقعہ یہ بھی لکھا ہے کہ جس دن ان کا اجمیر میں انتقال ہوا اسی دن سیتاپور میں ان کی بنوائی ہوئی مسجد کا ایک منارہ گر گیا — مولوی اکرام علی صاحب کا ۱۲۵۳ھ میں انتقال ہوا اور اجمیر ہی میں دفن کئے گئے — یہ رسالہ ۴ر میں صدیق بک ڈپو لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔

جامع التاریخ سید دلدار حسین صاحب اظہر الہ آبادی جو حیدر آباد میں ملازم ہیں وہاں کے مشہور تاریخ گو ہیں اور اس رسالہ میں انھوں نے اپنے متعدد قطعات تاریخ یکجا کردئے ہیں — اس مجموعہ میں بعض ایسے غیر اہم واقعات کی تاریخ بھی نظر آتی ہے کہ مجھے خیال ہوا ممکن ہے میرے حیدر آباد جانے آنے کی تاریخ بھی کسی شعر سے نکالی گئی ہو، لیکن یہ جستجو ناکام رہی — اشعار تاریخ جیسے ہوا کرتے ہیں ویسے ہی اس میں بھی نظر آتے ہیں۔ اور کوئی خاص بات اپنے اندر نہیں رکھتے۔

محبّت

محبت سے صبا درسِ چمن آرائی لیتی ہے
محبت گونجتی ہے نغمہ بنکر کوہساروں میں
محبت خون بنکر دوڑتی ہے مردہ جانوں میں
محبت حُسن کی آنکھوں سے اک ڈھلکا ہوا آنسو
محبت بیکسی میں ڈوبتے دل کا سہارا ہے
محبت اشکِ شبنم بنکے تھراتی ہے کانٹوں پر
محبت پھینک دیتی ہے کلاہ و تخت ٹھکرا کر
محبت رخ بدل دیتی ہے بہتے آبشاروں کا
محبت موت کے چہرے پر اک گہرا طمانچہ ہے
محبت کے کنول روشن ہیں دنیا کے شوالوں میں

محبت شعلہ بنکر برق میں انگڑائی لیتی ہے
محبت جلوہ فرما جھلملاتے ماہ پاروں میں
محبت رنگ بنکر اینڈتی ہے گلستانوں میں
محبت چاند تاروں کی طرف اڑتا ہوا جگنو
محبت نور سے بے بہرہ آنکھوں کا اُجالا ہے
محبت پستیوں کو کھینچتی ہے آسمانوں پر
محبت ایک مہلک تیر بنجاتی ہے لہرا کر
محبت چیر دیتی ہے کلیجہ کوہساروں کا
محبت زندگی کا غیر فانی اک ترانہ ہے
محبت دیکھتی ہے خواب روحانی اُجالوں میں

محبت سانپ بنکر خون پی لیتی ہے باطل کا
محبت کیف باقی ہے نشاطِ صبح منزل کا

فضل الدین اثر اکبرآبادی

آنکھ مچولی

آؤ کھیلیں آنکھ مچولی — آنکھ مچولی پریم کی ہولی
سا دن آیا پکی نبولی — وہ دیکھو وہ کویل بولی
— آؤ کھیلیں آنکھ مچولی

چھپ کے نظر سے دلمیں سماؤ — دلمیں سماؤ، روح پہ چھاؤ
ہر اک سانس میں آؤ جاؤ — آنکھ مچولی کھیلیں آؤ
— آؤ کھیلیں آنکھ مچولی

پہلے چاہے جتنا ستالو — حوصلے سارے دل کے نکالو
پھر کچھ ایسا ڈھنگ نکالو — میں تمہیں پالوں تم مجھے پالو
— آؤ کھیلیں آنکھ مچولی

سارے جہاں کی آنکھ بچا کر — رکھ لوں تم کو دلمیں چھپا کر
خود کو کھودوں تم کو پا کر — پریم سے اپنی آنکھ مچا کر
— آؤ کھیلیں آنکھ مچولی

کھیل ہی یہ مت شرماؤ تم — میں ہوں چور نہ گھبراؤ تم
چور کو آتا جب پاؤ تم — دوڑ کے دلمیں چھپ جاؤ تم
— آؤ کھیلیں آنکھ مچولی

چور بنے تم حیراں ہوں میں — کیا کروں اب اور کیا نہ کروں میں
تم سے بھلا کس طرح بچوں میں — کس کے دلمیں جا کے چھپوں میں
— آؤ کھیلیں آنکھ مچولی

پریم اندھا دھند دوڑ کر آیا — بھاگو بھاگو چور ادھر آیا
لو وہ تو دل میں اتر آیا — ہم کو تم کو سب کو ہرایا
— آؤ کھیلیں آنکھ مچولی

اس نگری کی ریت یہی ہے — جیت یہی ہے پریت یہی ہے
ہار نا من کا جیت یہی ہے — تمکیں پریت کی ریت یہی ہے
— آؤ کھیلیں آنکھ مچولی

تمکین سرمست

ایک جلاوطن کی واپسی

(بمبئی کے ساحل پر)

پھر خبر گرم ہے وہ جانِ وطن آتا ہے
پھر وہ زندانیِ زندانِ وطن آتا ہے
وہ خرابِ گُل و ریحان وطن آتا ہے
مصر سے یوسفِ کنعان وطن آتا ہے

"کوئی معشوق بصد شوکت و ناز آتا ہے
سرخ بیرق ہے سمندر میں جہاز آتا ہے

رندِ بے کیف کو تھی بادہ و ساغر کی تلاش
ناظرِ منظرِ فطرت کو تھی منظر کی تلاش
ایک بھنورے کو خزاں میں تھی گلِ تر کی تلاش
خود صنمخانۂ آذر کو تھی آذر کی تلاش

مژدہ اے دوست کہ وہ ابرِ بہار آپہونچا
اپنے دامن میں لئے برق و شرار آپہونچا

اپنا پرچم کچھ عجب شان سے لہراتا ہے
رنگ اغیار کے چہروں سے اُڑا جاتا ہے
کوئی شاداں کوئی حیراں، کوئی شرماتا ہے
کون یہ ساحلِ مشرق پہ نظر آتا ہے

اپنے میخانہ کا اک مے کشِ بے حال ہے یہ!
ہاں وہی مردِ جواں بخت و جواں سال ہے یہ!

مردِ سرکش تجھے آدم کی کہانی کی قسم
روحِ انساں کے تقاضائے نہانی کی قسم
جذبۂ عیش کی ہر شورشِ فانی کی قسم
تجھ کو اپنی اُسی بدمست جوانی کی قسم
آ کہ اکبار گلے سے تو لگا لیں تجھ کو
اپنے آغوشِ محبت میں اُٹھا لیں تجھ کو

نطق تو اب بھی ہے پر شعلہ فشاں ہے کہ نہیں
سوزِ پنہاں سے تری روح تپاں ہے کہ نہیں
تجھ پہ یہ بارِ غلامی کا گراں ہے کہ نہیں
جسم میں خونِ جوانی کا رواں ہے کہ نہیں
اور اگر ہے تو پھر آ تیرے پرستار ہیں ہم
جنسِ آزادیِ انساں کے خریدار ہیں ہم

ساقیا ورند ترے ہیں، مئے گلفام تری
اُٹھ کہ آسودہ ہے پھر حسرتِ ناکام تری
برہمن تیرے ہیں، کل ملتِ اسلام تری
صبح کاشی تری، سنگم کی حسیں شام تری
دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ
تو جو شمشیر اُٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

دیکھ بدلا نظر آتا ہے گلستاں کا سماں
ساغر و ساز نہ لے جنگ کے نعرے ہیں یہاں
یہ دعائیں ہیں، وہ مظلوم کی آہوں کا دھواں
مایلِ جنگ نظر آتا ہے ہر مردِ جواں
سر فروشانِ بلاکش کا سہارا بن جا
اُٹھ اور افلاک بغاوت کا ستارا بن جا

مجاز بی اے (علیگ)

چاند سے خطاب

اے شبستانِ ارم نار کے زریں مہتاب!
ایک مدت سے ہے تو یاد میں کسکی بیخواب؟

رہروِ چرخ! تری چرخ نوردی کیوں ہے؟
اے مسافر! ترے چہرے پہ یہ زردی کیوں ہے؟

تیری نظروں میں ہیں کس شوخ کے کافر جلوے
تو افق پر کسے کرتا ہے پیاپے سجدے؟

کون جانے کہ ترے دل میں ہے کسکی اُلفت
کسکے غم نے تجھے بخشی ہے دوامی حسرت

تو امینِ غمِ فطرت ہے تو فطرت میں ہوں
تو مرقع ہے مرا تیری حکایت میں ہوں

تجھ میں اک داغ ہے دل میں ہیں مرے سو سو داغ
تو گلِ عشق ہے اور میں ہوں محبت کا چراغ

ہاں مگر مجھ میں پر اسرار ئی پرواز نہیں
اے مرے چاند! مرا راز کوئی راز نہیں

تو بہر رنگ طلسمات کن اک دنیا ہے
تو بہر حال جمالات کی اک دنیا ہے

خیر اب حرف و حکایات کا یہ وقت نہیں
باتوں باتوں میں یونہی صبح نہ ہو جائے کہیں

مجھکو اک بات بتا دے مہ افلاک بلند
تو نے پھینکی ہے بہت دہر پہ کرنوں کی کمند

ایسی دنیا بھی سفر میں نظر آئی ہے کہیں
جسکی خود آپ وہوا ہو مرے نغموں کی امیں؟

جسکے دامن میں نظر رقص کرے اور کھو جائے
جسکی آغوش میں آسودہ محبت سو جائے؟

محو ہو جائے جہاں روح فراموشی میں،
میں بھی کھو جاؤں جہاں عالمِ مدہوشی میں

فطرت واسطی

اگر میں خُدا ہوتا

تبسم کھیلتے ہر سو نگاہوں کی جوانی کے
ترنم آفریں لمحات ہوتے زندگانی کے

فلک پر مستیوں کے جانفزا بادل مچل جاتے
وفورِ شوق سے ساغر بکف انجم اُتر آتے

فضا کے دوش پر بابِ محبت کھُل کے رہ جاتا
ہر اک ذرّہ شرابِ حسن کے دریا میں بہہ جاتا

زمیں سے پھوٹتے چشمے شرابِ ارغوانی کے
قدم لیتی بہارِ خُلد ہر رنگیں جوانی کے

مری مخلوق میں اب کیا کہوں کیا بانکپن ہوتے
گلوں کی پتیوں کے پیرہن زیبِ بدن ہوتے

شبابِ جاودانی ذرّے ذرّے کو عطا کرتا
ہر انساں پر میں بابِ عشرتِ جاوید وا کرتا

نہ یہ سرمایہ داری اور نہ یہ مزدور ہی ہوتے
نہ لوگ اپنے لہو کو کر کے پانی زندگی کھوتے

نہ یوں افلاس میں بے موت مرتے زندگی والے
نہ یوں سرمایہ داری ڈال سکتی رزق پر تالے

لہو ہوتا نہ یوں انصاف کا رحم و مروّت کا
نہ ہوتا قحط دنیا میں مری عیش و مسرت کا

نہ ہوتے یہ ہلاکت آفریں سامانِ بربادی
وہی مشرق میں بھی ہوتی جو مغرب میں ہے آزادی

نہ یوں بے جرم انسانوں کی خوں کے ندیاں بہتیں
نہ یوں کمزور قومیں زور والوں کے ستم سہتیں

الطاف مشہدی

کلامِ فراق گورکھپوری

یہ بار بار وعدۂ سکونِ مرگ کس لئے
نگاہِ یار تیرے چھیڑنے کی اور بات ہے
تمام درد ہجر ہے، تمام حسنِ یار ہے
دلِ حزیں زمانہ ہے کہ گوشِ بر سکوت ہے
صلائے عام عشق ہے فریبِ خلد میں نہ آ
تڑپنے دے کسی کو کیا کسی کو چین دے تو کیا
کبھی کبھی تو حسن کو بھی درگزر ضرور ہے
ہیں یوں تو بے نیازیوں کو تیری لاکھ مشغلے
خبر نہ تو نے جن کی لی وہ لوگ اب فسانہ ہیں
فسردہ سی فضا میں بجلیوں کی رو بھی آگئی
ازل سے جو نہ مٹ سکی وہ بیکسی تھی عشق کی
میں پوچھتا تو ہوں مگر جواب کے لئے نہیں
بس ایک عشق کے خراب ہونے ہی کی دیر تھی

اب یاد رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
صیاد اس طرح تو فریبِ سکوں نہ دے

پرسشِ پنہاں نہ اس درجہ بڑھانا چاہئے
مدتیں گزریں سکون یاس بھی پائے ہوئے

اک فسوں ساماں نگاہِ آشنا کی مہر تھی
سامنے تیرے قیامت ہے یہ کیفِ انتظار
احتیاطِ عشق کی اسوقت کوئی داد دے

جیسے فنا بقا میں بھی کوئی کمی سی ہو
دنیا سے اے دل اتنی طبیعت بھری نہ تھی

کچھ اس قدر تو اہلِ غم کو زندگی گراں نہیں
ملول بھی کہاں ہوں میں اگرچہ شادماں نہیں
اک اضطراب، اک سکوں کسے نہیں کہاں نہیں
فسانہ زیرِ لب نہیں، نظر میں داستاں نہیں
عذاب سہ، عذاب سہ، نجات میں ہے کیا دھرا
تری نظر کی پے بہ پے یہ جنبشِ سکوں نما
یہ بیخودی معاف کر کچھ آج یاد آگیا
جو ہو سکے تو اہلِ درد کو بھی یاد آئے جا،
پتہ نہ جس کا تھا تجھے وہ غم دلوں کو کھا گیا
مجھے اُداس دیکھ کے یہ کون مسکرا دیا
تری نگاہِ لطف نے ہزار آسرا دیا
یہ کیوں تری نظر پھری یہ کیوں بدل گئی ہوا
شباب تھا سنور گیا زمانہ تھک گزر گیا

یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں
اس درجہ تو مجھے بھی غمِ آشیاں نہیں

رشتۂ امید اکثر ٹوٹ جانا چاہئے
اب تو اس جانِ تغافل کو بھی آنا چاہئے

اس بھری دنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے
آہ جب امروز بھی فردا نظر آنے لگے
جب نگاہِ یار بھی رسوا نظر آنے لگے

مجھ کو پڑی ہے تیری ضرورت کہاں کہاں
تیرے لئے اُٹھائی ندامت کہاں کہاں

کلامِ اختر انصاری

یہ صبح و شام کے منظر مسرت بخش ہیں لیکن
نظر گلرنگ، عارض لالہ گوں، زلفیں شمیم انگیز
میں کب تک اس طرح بہلاؤں یارب دل کے ارماں کو
خدا آباد رکھے اس جوانی کے گلستاں کو

چھیڑا جو تو نے ساز کے پردوں کو، سچ کہوں،
یادش بخیر، عہدِ محبت کی شاعری
محسوس یہ ہوا کہ مری جاں نکل گئی
اک آہ تھی جو گیت کے سانچے میں ڈھل گئی

کوئی مآلِ محبت مجھے بتاؤ نہیں
محبت اور جوانی کے تذکرے نہ کرو
میں خواب دیکھ رہا ہوں مجھے جگاؤ نہیں
کسی ستائے ہوئے کو بہت ستاؤ نہیں

اُس سے پوچھے کوئی چاہت کے مزے
غنچہ تھا دل، پر یہ کیسا غنچہ تھا
رو رہا ہوں موسمِ گُل دیکھ کر
اختر اب برسات رخصت ہوگئی
جس نے چاہا اور جو چاہا گیا!
جو کھِلا اور کھِلتے ہی مُرجھا گیا!
میں سمجھتا تھا مجھے صبر آگیا!
اب ہمارا رات کا رونا گیا،

عیش و عشرت کے تذکرے نہ کرو
سُن لو جا کے شکستِ دل کا حال
اب کے فصلِ بہار کیسی رہی
نامرادوں سے، غم کے ماروں سے
سازِ مطرب کے ٹوٹے تاروں سے
پوچھئے پیرہن کے تاروں سے

کہہ دو اختر جو دل پہ گزری ہے
کیوں چھپاتے ہو بات یاروں سے